بے نشانوں کا نشان
مظہر محمود شیرانی

بے نشانوں کا نشاں

(خاکوں کا مجموعہ)

مظہر محمود شیرانی

اساطیر - لاہور

کتاب: .... بے نشانوں کا نشاں (خاکے)

مصنف: .... مظہر محمود شیرانی

اہتمام: .... منصورہ احمد

کمپوزنگ: .... ایم ناصر بٹ (اساطیر)

پروف خوانی: .... احمد رضا

مطبع: .... ایس اینڈ ٹی پرنٹرز 74-عمر سٹریٹ بلال گنج، لاہور

سنہ اشاعت: جنوری 2006ء

تعداد: ایک ہزار

قیمت: .... 170 روپے

اساطیر

45-A مزنگ روڈ لاہور

فیکس، فون: 6304820

ای میل: funoonasateer@yahoo.com

محترم مشفق خواجہ (مرحوم) کے
نام جن کی تحریک پر یہ خاکے
لکھے گئے۔

ز شورِ بے نشانی ' بے نشانی شد نشاں بیدلؔ
کہ گم گشتن ز گم گشتن بروں آورد عنقا را

مندرجات

خاکے

پیش گفتار

مظہر محمود شیرانی سے میری ملاقات پہلے پہل انیس سو ساٹھ کی دہائی میں وولنر ہاسٹل میں ہوئی مگر ان کے باپ دادا نے بہت پہلے سے مجھے گھیر رکھا تھا۔ میں نویں جماعت میں آیا تو ''سرمایۂ اردو'' ہمارے نصاب میں آئی۔ یہ حافظ محمود شیرانی صاحب کا انتخاب تھا جو کئی نسلوں نے پڑھا۔ اس کتاب نے میرے ادبی ذوق کی بنیادیں درست کیں۔ حافظ صاحب گو بیٹے سے خفا تھے مگر محقق آدمی تھے ''ہنرش نیز بگو'' کے قائل۔ چنانچہ حصۂ نظم میں اختر شیرانی کی تین نظمیں بھی شامل تھیں۔ ایک ''وادیِ گنگا میں ایک رات'' دوسری ''تنہائی'' جو غالبؔ کی زمین میں تھی اور تیسری ''روس سے نپولین کی مراجعت'' جس میں ماسکو کی برف باری سے مجبور ہو کر واپس جاتے ہوئے ایک ناکام فاتح کے احساسات نظم کیے گئے تھے:

رخصت، اے روس! آہ اے ویرانۂ خونیں بہار
اے شکوہِ قہرمانانِ جہاں کی یادگار
کر چکی ہیں میری تلواریں ترے ہونٹوں کو پیار

یہ تیسرا مصرع تو گویا میرے ذہن پر جم کر ہی رہ گیا اور آج تک نقش ہے۔

اب جو وولنر ہاسٹل میں مظہر محمود نظر آئے اور ان کے حسب نسب کا علم ہوا تو ان کے پرکھوں نے رعب کی چادر درمیان تان دی۔ انھوں نے خود بھی اپنے کمرے کے دروازے پر ایک نستعلیق سی چق آویزاں کر رکھی تھی جو اس زمانے کے ہاسٹل میں

ــــــــ بلکہ شاید آج بھی ــــــــ ایک بدعت سے کم نہ تھی۔ یوں وہ ایک ظاہری اور ایک باطنی چق کی اوٹ میں رہے ــــــــ حجاب ہٹانے کا رجحان میری طبیعت میں کبھی تھا ہی نہیں لہٰذا مظہر محمود صاحب سے تعلق علیک سلیک سے آگے نہ بڑھ سکا۔ بہت بعد میں جا کر جب انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو ان کی محبت و مروّت، ذہانت و علمیت، شگفتگیٔ مزاج اور سب سے بڑھ کر اپنائیت اور انسانیت نے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ مگر اس قریبی مشاہدے سے بھی پہلے ایک اور کھڑکی میرے اور ان کے درمیان کھل چکی تھی۔ یہ ان کی خاکہ نگاری کی کھڑکی تھی۔

اُن شخصیات سے بھی بڑھ کر جن کا خاکہ لکھا جا رہا ہوتا ہے، خاکہ نگاری خود خاکہ نگار کی شخصیت کو منکشف کرتی ہے۔ ''فنون'' میں جب بھی مظہر محمود صاحب کا لکھا ہوا کوئی خاکہ چھپتا، میں سب سے پہلے اس کو دیکھتا اور ہاتھ میں لینے کی دیر ہوتی تھی کہ ختم کیے بغیر ہاتھ سے رکھنا ممکن نہ رہتا۔ ان کے دلچسپ اندازِ نگارش کے علاوہ جو چیز بے ساختہ مجھے اپنی طرف کھینچتی تھی وہ ان کے مشاہدے کا زاویہ تھا۔ نہایت درجہ معروضی اندازِ نظر کے باوجود اپنے کرداروں سے گہری محبت اور ایک دردمندانہ تعلق ہر خاکے کے تار و پود میں گندھا ہوا دکھائی دیتا تھا جو دراصل کُل بنی نوع سے ــــــــ ان کی تمام تر خامیوں اور ناکامیوں کے ساتھ ــــــــ ٹوٹ کر پیار کرنے کا غماز ہے۔ ہمہ گیر ہمدردی کی یہ زیریں لہر اعلیٰ ادب کو ادنیٰ ادب سے تمیز کرتی ہے اور وعظ کے بجائے درد کے وسیلے سے 'صلاحِ باطن' کا ذریعہ بنتی ہے۔

قاعدہ ہے کہ آدمی کے آس پاس جس چیز کی بہتات ہو اس سے جی بھر جاتا ہے۔ مظہر محمود صاحب نے چونکہ مشاہیر کے گھرانے میں آنکھ کھولی اس لیے انھیں مشاہیر سے کہیں زیادہ عام آدمی اور گمنام سپاہی نے لبھایا۔ یہاں وہ سمرسٹ ماہم کے ہم ذوق نظر آتے ہیں۔ اپنی مشہور کتاب The Summing Up میں ماہم نے

مشاہیر کے بارے میں یہ شکوہ کیا ہے کہ وہ لوگوں سے ملنے جلنے کا ایک ایسا گر سیکھ لیتے ہیں کہ ان کی اصل شخصیت ہمیشہ پس نقاب رہتی ہے جبکہ عام آدمی ایک کھلی کتاب کی طرح ہوتا ہے۔

ماہم کے اپنے الفاظ میں:

"I have been more Concerned with the Obscure than with the famous. They are more often themselves."

مظہر محمود صاحب نے مشاہیر کے خاکے بھی لکھے ہیں اور بہت خوب لکھے ہیں مگر مجھے یہی محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اپنے بطونِ ذات کی برجستہ شمولیت ان خاکوں میں زیادہ ہے جو عام اور گمنام کردارں پر لکھے گئے ہیں۔ یہاں ان کے چاک پر مٹی نرم اور بے ہیئت ہوتی ہے جس کے خط وخال وہ خود نکالتے ہیں جبکہ مشاہیر کے خط وخال بالعموم ٹھہرے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ ایک نئے زاویے سے انھیں دیکھ اور دکھا سکتے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے میں صرف گمنام کردار شامل ہیں جو پہلی بار مظہر محمود صاحب کے خاکوں ہی میں بے چہرگی کی دہلیز پار کر کے چہرہ نمائی کرتے ہیں اور ٹامس گرے کی مشہورِ زمانہ Elegy کی یاد دلاتے ہیں:

یہ صاحب عزم ہیں گو رزم کی نوبت نہیں آئی
حکومت اپنے قریے میں کی، لیکن دوست دشمن پر
وہ فردوسی ہیں یہ جن کی زباں کھلنے نہیں پائی
وہ رستم ہیں، نہیں سہراب کا خوں جن کی گردن پر

(ترجمہ: نظم طباطبائی)

بے نشاں لوگوں کے ان خاکوں میں ایک خاکے کا عنوان ہی "بے نام" ہے۔ یہ باکمال خاکہ ازحد پُرتاثر ہے جسے پڑھ کر دل سخت اداس ہو جاتا ہے۔ اسی طرح

گل نبی کا خاکہ پڑھ کر اس کی عظمتِ کردار کا نقش دل پر ثبت ہو جاتا ہے اور اختتام تک آتے آتے آنکھ نم ہونے لگتی ہے۔

مظہر محمود صاحب کی قوتِ مشاہدہ حیرت انگیز ہے چنانچہ ان کے خاکوں میں جزئیات نگاری نہایت زندہ اور دلکش ہوتی ہے۔ ان کی آنکھ متحرک کیمرے سے کم نہیں۔ وہ کسی ماہر عکس بند کی طرح، پہلے کسی منظرنامے کا Establishing Shot لاتے ہیں جس میں دور دور تک کا منظر اور پس منظر اپنے مجموعی تناظر میں ابھرتا ہے اور پھر ''زوم اِن'' کرتے ہوئے کیمرے کو کسی خاص مقام اور پھر خاص فرد یا افراد پر مرتکز کر دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر ایک خاکے ''شاہ صاحب'' کی یہ چند سطور دیکھیے:

''میں نے بستی کا سرسری سا جائزہ لیا جو گنتی کے گھروں پر مشتمل تھی۔ مغربی جانب مکانات تھے اور بیچ میں ایک بڑا میدان خالی چھوڑ کر مشرق کی طرف شاہ صاحب کا ڈیرہ اور مہمان خانہ واقع تھا۔ میدان کے شمال مغربی گوشے میں مسجد اور شمالی جانب مویشیوں کا احاطہ تھا۔ جنوب کی سمت بہاول نگر سے آنے والی پختہ سڑک کو راستہ جاتا تھا۔

ہمارا مختصر سامان مہمانوں کے مخصوص کمرے میں رکھ دیا گیا اور چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم ڈیرے کے وسیع و عریض ٹپ کے نیچے آ گئے۔ سخت سردی کی وجہ سے ٹپ کے بیچوں بیچ لکڑیوں کا ایک الاؤ روشن تھا۔ اس کے گرد ایک دائرے کی صورت میں کرسیاں اور پھر چاروں طرف پچیس تیس چارپائیاں جن کے سرہانے تکیے اور پائنتی کھیس بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ کئی حُقے تازہ کیے ہوئے موجود تھے۔''

اور ایک اقتباس ''دِیا کہاں گئے وے لوگو!'' کا بھی دیکھیے:

"آفتاب اپنا سفر پورا کر رہا تھا۔ شام کا یہ وقت دل پر ایک خاص اثر کرتا ہے' جیسے کسی عزیز ہستی کا دم واپسیں ہو۔ ہم کوٹلی لوہاراں سے شمال کی سمت پیدل چل پڑے۔ کوئی میل بھر کھیتوں کی مینڈوں اور پگڈنڈیوں پر چلنے کے بعد ایک چھوٹے سے گاؤں کوٹلی چندو پہنچے۔ زیادہ تر کچے مکان تھے۔ ایک احاطے میں داخل ہوئے جس میں چاروں طرف کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ ایک کمرے میں دو بزرگ شخص' سفید کپڑوں میں ملبوس' کھیس لپیٹے' دو چارپائیوں پر تکیوں کے سہارے نیم دراز تھے۔ بیچ میں حقّہ رکھا تھا۔ یہ سعید صاحب کے ماموں تھے۔ انھیں دیکھ کر مجھے ایک انگریزی نظم کی یہ دو سطریں یاد آ گئیں:

"Old age, serene and bright
And cold as a lapland night"

مظہر محمود صاحب کے ہاں منظر نگاری محاکاتِ محض سے عبارت نہیں ہوتی بلکہ خارجی مناظر کو باطنی احساسات سے مربوط کرتی ہے۔ غروبِ آفتاب کے منظر کو کسی عزیز ہستی کے دمِ واپسیں سے مربوط کرنا کیسا شاعرانہ تخیّل ہے۔ متخیلہ کی اس قوت کے نمونے جابجا ان خاکوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ بعض خاکوں میں جگہ جگہ عبارت پر نمبر لگے ہوئے ہیں اور آخر میں ان سے متعلق حواشی فراہم کیے گئے ہیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ مظہر محمود صاحب نے تخیّل کی یہ زرکاری باپ سے اور یہ دقیق حاشیہ نگاری دادا سے ورثے میں پائی ہے۔ یوں تخلیق و تحقیق کا ایک نادر توازن ان کے ترازوئے ذہن میں تُلا ہوا دکھائی دیتا ہے اور 'بیچوں بیچ' جہاں بینی کا اضافہ ان کا اپنا ہے۔

مظہر محمود صاحب کو ایجاز و اطناب کی حدود کا فطری شعور حاصل ہے۔ جہاں جہاں وہ بات کو طول دیتے ہیں حکایت لذیز تر ہوتی چلی جاتی ہے اور جہاں ایک ایک

جملے میں بات کو سمیٹتے ہوئے جست در جست آگے بڑھتے ہیں وہاں محسوس ہوتا ہے کہ اگر وہ بیچ کی تفصیلات میں الجھ جاتے تو خاکہ اپنی سمت کھو بیٹھتا۔ یہ وہ طائرانہ جبلّت ہے جس کی بدولت پرندہ بیکراں نیلگوں وسعتوں میں پرواز کرتے ہوئے اپنے خطِ رہ سے بھٹکنے نہیں پاتا۔

ان خاکوں میں بڑا متنوع ادبی وثقافتی پس منظر غیر معمولی عُمق کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ کہیں انگریزی اور کہیں فارسی شاعری کے اقتباسات، کہیں تاریخ گوئی، کہیں پھیری والوں کی کوئی مخصوص ہانک اور کہیں یونانی دیومالا کے 'Cyclops' مصنف کے ذہن کی اس گہری اور بوقلموں بافت کا سراغ دیتے ہیں جو اب قریب قریب نایاب ہے اور جس کی تہیں ان پرانی عمارتوں میں چونے کے پلستر کی تہوں سے مشابہ ہیں جو بقولِ مصنّف ان کی کمزوری ہیں۔

زبان وبیان پر مظہر محمود صاحب کو قابلِ رشک قدرت حاصل ہے۔ وہ الفاظ میں نہ اِسراف کے قائل ہیں نہ بُخل کے۔ ایک ماہر مصوّر کی طرح، رنگوں کو ٹھیک ٹھیک صرف کرتے ہوئے، مُوقلم کی دو چار ہی جنبشوں میں وہ بسا اوقات ایک بولتی ہوئی تصویر بنا دیتے ہیں:

''ریڈیو پاکستان ڈھاکہ سے منسلک ایک کلاسیکی گویّے تھے مستان گاما - ریڈیو کے پندرہ روزہ رسالے ''آہنگ'' میں ان کا فوٹو چھپا تھا۔ پکا رنگ، کُتر واں ڈاڑھی، درویشانہ وضع قطع، موسیقی کے نشے میں غرق معلوم ہوتے تھے۔ گویا اسم بامسمّٰی تھے''

....

'' ...... باتیں ذرا رُک رُک کر کرتے تھے اور لہجے میں امریکنوں کی طرح ہلکی سی غناہٹ تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں واقعات کی تصویر کشی میں مزاحم

ہونے کی بجائے معاون ثابت ہوتی تھیں۔"

مظہر محمود صاحب اپنے بارے میں کچھ لکھتے ہی نہیں۔ ان خاکوں کی یہ بھی مہربانی ہے کہ اس خاکسار کو موسیقی سے ان کی دلچسپی اور علم موسیقی پر ان کی نظر کا علم ہوا۔ میں اس کوچے سے نابلد ہی سہی مگر ایک ترشے ہوئے ہیرے کا ایک اور پہلو تو کھلا۔ اب کسی روز ان سے دیپک کی فرمائش کروں گا کہ دل میں یادوں کے دھواں دیتے ہوئے چراغ پھر سے جل اٹھیں۔

ان خاکوں میں مزاح کی ایک اعلیٰ حس جابجا' تبسّم کی ایک ہلکی سی لکیر کی طرح کوندتی نظر آتی ہے جو نہ قہقہہ بنتی ہے نہ زہرخند ____ لیکن قارئین! میں کہاں تک ہاتھ میں مشعل لیے اس شیش محل میں آپ کے آگے آگے چلوں۔ ایک خاص حد سے آگے مشعل برداری کا یہ عمل بھی دخل در معقولات کی ایک صورت بن جاتا ہے۔ مناسب یہی ہے کہ اب اس جگمگاتے اسرار میں مشعل خود آپ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے میں اذنِ رخصت لوں:

حجابِ راہ توئی حافظ از میاں برخیز
خوشا کسے کہ دریں راہ بے حجاب رود

خورشید رضوی

۲۲ مئی ۲۰۰۵ء

گفتنی

یہ میرے تحریر کردہ خاکوں اور اگر یہ خاکے کی تعریف پر پورا نہ اترتے ہوں تو شخصیات پر مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ ان کی اشاعت کا آغاز شیخوپورہ کالج کے رسالے ''مرغزار'' سے ہوا تھا۔ ایک عرصے بعد ''مرغزار'' کے دو شمارے مشفق خواجہ مرحوم کی نظر سے گزرے۔ انھوں نے اظہارِ پسندیدگی کرتے ہوئے ان پرچوں میں شامل میرے دو مضامین ماہنامہ ''قومی زبان'' کے شمارۂ اکتوبر ۲۰۰۰ء میں چھاپ دیے۔ ساتھ ہی محبیّ احمد ندیم قاسمی صاحب کو متوجہ کیا۔ چنانچہ ''فنون'' میں ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تو بعض قارئین کو یہ اچھے لگے اور انھوں نے مدیرِ فنون کے نام خطوط میں اس بات کا اظہار کیا جس سے میری حوصلہ افزائی ہوئی۔ آگے چل کر مشفق خواجہ، ڈاکٹر مختار الدین احمد (علی گڑھ) اور ڈاکٹر اسلم فرخی (کراچی) صاحبان نے ان تحریروں کو کتابی صورت دینے کا تقاضا کیا۔ یہ مجموعہ انھی کرم فرماؤں کی خواہش اور امتثال کا نتیجہ ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ صرف ایسے مضامین پر مشتمل ہے جو گمنام لوگوں پر لکھے گئے ہیں۔ کتاب کا نام بھی اسی حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان میں شمال مغربی کہساروں سے لے کر راجستھان کے ریگزاروں اور لاڑکانہ سے لے کر سیالکوٹ کے دیہی علاقے تک کے کم سواد اور بے سواد لوگ شامل ہیں۔ ان کو اپنا موضوع بنانے میں میرے انتخاب کا کوئی دخل نہیں۔ یہ کردار زبانِ حال سے پکار پکار کر کہتے تھے کہ ان کا تعارف

صاحب دل لوگوں سے کرانا انسانیت کی خدمت کے مترادف ہے۔ ان سب میں ایک قدرِ مشترک یہ تھی کہ وہ مجھ سے دلی محبت کرتے تھے جس کا سبب جاننے سے میں قاصر ہوں۔ آج بھی میں دوستوں اور عزیزوں کی محفل میں ان مرحومین کو یاد کر کے چند لمحوں کے لئے غم غلط کر لیتا ہوں۔

یاں چھپتی دھوپ ہے ' گلابی سایہ
رہتا ہے سحابِ ابدیت چھایا
جوشؔ آؤ کہ منتظر ہے بزمِ ارواح
آیا ' یارانِ رفتہ ' آیا ' آیا

مظہر شیرانی

خاکے

گل نبی

مجھے ۱۹۵۸ء میں پہلی بار صوبہ سرحد کے بعض حصے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ شعبۂ تاریخ' جامعۂ پنجاب کے طلبہ ڈاکٹر ظفر الاسلام (مرحوم) کی معیت میں مطالعاتی دورے پر گئے تھے۔ راولپنڈی، ٹیکسلا، حسن ابدال، اٹک، نوشہرہ، تخت بھائی، مالاکنڈ، پشاور اور درۂ خیبر کے تاریخی آثار دیکھے۔ مالاکنڈ سے سوات قریب تھا لیکن یہ ہمارے پروگرام میں شامل نہ تھا۔ سوات جانے کا موقع ۱۹۶۰ء میں ملا جب شعبۂ فارسی، اورینٹل کالج کے طلبہ کا ایک گروپ ڈاکٹر محمد باقر (مرحوم) کے ہمراہ تفریحی سفر پر روانہ ہوا۔ ہم لوگ کالام تک گئے۔

اب اور جب کے سوات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ زمینی کثافتوں اور فضائی آلودگی کے باعث اب تو اس کا چہرہ بھی مشکل سے پہچانا جاتا ہے۔ اُس زمانے میں آبادیاں مختصر اور راستے دشوار گزار تھے۔ پہاڑ جنگلوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور وادیاں سبزے سے۔ موسم میں خنکی اور ہوا میں تازگی کا وہ عالم جس کے لیے شاعر نے کہا ہے:

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر ۔ بادہ نوشی ہے باد پیمائی

اور ان تمام خوبیوں پر مستزاد ایسا سکون جس پر خاموشی بھی فدا ہو۔ میری وحشت زدہ طبیعت کو یہ ماحول اور مناظر ایسے پسند آئے کہ گذشتہ چالیس برسوں میں موسم گرما کی چھٹیوں میں کالام کا پھیرا شاید ہی قضا ہوا ہو۔ عرصے تک بعض عزیزوں یا ہم مذاق دوستوں کے ساتھ جاتا رہا۔ پھر اہلِ خانہ کے تقاضوں پر انھیں بھی لے جانے

لگا۔ تاہم دوستوں کے ساتھ کوہ نوردی کا اپنا لطف ہوتا ہے، لہٰذا سال میں ایک سے زیادہ چکر بھی لگ جاتے ہیں۔

خدا جانے اچھی ہے یا بری لیکن انگریزوں کی مانند میری عادت دورانِ سفر خاموش رہنے کی ہے۔ اسی طرح سیر وتفریح کی غرض سے جاؤں تو اجنبی لوگوں سے بقدرِ ضرورت ہی بات کرتا ہوں۔ اس مردم بیزاری کا قدرتی نتیجہ کہیے کہ سنہ ۱۹۸۰ء تک میں کالام کے کسی مقامی شخص کا نام تک نہیں جانتا تھا۔ اتفاق سے ۱۹۸۰ء میں عزیزی عبدالقیوم اپنے دوستوں کے ساتھ تفریح کی غرض سے کالام گیا۔ موصوف مزاج کے اعتبار سے میرے برعکس بڑے ملنسار واقع ہوئے ہیں۔ بہرحال واپسی پر وہ مجھے اپنے تاثراتِ سفر بتاتے ہوئے کہنے لگا کہ ''جس شخص کے ہوٹل میں ہم کھانا کھاتے تھے وہ بہت ہی اچھا آدمی ہے۔ دیانت دار اور مخلص۔ اس نے ہماری خوشنودی کا بڑا خیال رکھا اور گاہکوں جیسا نہیں بلکہ مہمانوں کا سا سلوک کیا۔''

میں نے جواب دیا: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لوگ ہمارے مقابلے میں فطرت اور دینِ فطرت سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے اخلاقی اعتبار سے بہتر ہیں لیکن میں آنکھیں بند کر کے تمھارے تجزیے سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ یوں بھی امریکنوں کی طرح تمھاری عادت ہر ایک سے بے تکلف ہونے کی ہے۔ جان نہ پہچان، بڑی خالہ سلام۔''

بولا: ''اچھا اگلی بار جب ساتھ چلیں گے تو خود دیکھ لینا۔ ابھی تو آپ اتنا کیجیے کہ جس دن لاہور جانا ہو وہاں سے بنیادی دینی موضوعات پر کچھ کتابچے لے آنا۔''

''وہ کس لئے؟''

''بات یہ ہے کہ کالام سے واپس لوٹتے ہوئے ہم نے اس شخص سے پوچھا کہ ادھر لاہور کی طرف کوئی کام ہو تو بتائیں۔ اس پر اس نے کہا کہ آپ کچھ عام فہم دینی

کتابیں بھجوادیں۔ہم گاؤں کے بچوں کے لئے ایک دارالمطالعہ بنا رہے ہیں۔''

''کیا کچھ پڑھا لکھا آدمی ہے؟''

''نہیں' بالکل ان پڑھ ہے۔''

مجھے پہلی بار اس شخص میں غائبانہ دلچسپی پیدا ہوئی۔

''کتابیں بھیجنے کے لئے پتہ لائے ہو؟''

''چھوٹی سی تو جگہ ہے۔وہاں سب اسے جانتے ہیں۔بس اس کا نام اور ڈاک خانہ کالام ضلع سوات لکھ دینا کافی ہوگا۔''

''اور نام کیا ہے؟''

''گل نبی۔''

چند دن بعد میں لاہور سے چھوٹی چھوٹی بہت سی کتابیں لے آیا اور ان کا پارسل روانہ کردیا۔

۱۹۸۱ء کے موسمِ گرما میں ہم حسبِ معمول کالام پہنچے۔ایک ہوٹل کے کمرے میں سامان رکھا اور ذرا ستا کر عصر کے قریب باہر نکلے۔پُل پار کر کے دوسری طرف بائیں جانب کھانے اور چائے کا ایک عام سا ہوٹل تھا۔اندر خاصی کشادہ جگہ تھی جس میں میزوں کے ساتھ بینچ لگے تھے اور چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ہم نے بیٹھنے کی خاطر ایک لڑکے سے چائے لانے کو کہا۔عبدالقیوم کی نظریں گل نبی کو تلاش کر رہی تھیں۔ذرا دیر بعد وہ باہر سے آتا دکھائی دیا۔عبدالقیوم نے چپکے سے کہا''وہ ہے!'' پھر وہ اٹھ کر آگے بڑھا اور نووارد کو سلام کیا۔گل نبی بڑی گرم جوشی سے گلے ملا اور خیریت پوچھتے ہی بولا:''آپ نے جو کتابیں بھیجا تھا وہ مل گیا تھا۔''عبدالقیوم نے فوراً ہی میری طرف اشارہ کر کے کہا:''چچا جان آئے ہیں' جن کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔'' وہ میرے پاس آیا اور اس انداز سے معانقہ کیا جیسے برسوں کا شناسا ہو۔میں نے اس کے سراپا کا

جائزہ لیا۔درمیانہ قد' اکہرا بدن'ستا ہوا چہرہ'متناسب ڈاڑھی' عمر یہی کوئی پینتیس چھتیس سال ہوگی ۔وہ سرحدی انداز اور کہستانی لہجے میں روانی سے اردو بول رہا تھا۔سادگی اور دھیما پن اس کی ہر بات سے عیاں تھا۔وہ ہمارے ساتھ چائے نوشی میں شریک ہو گیا۔چائے کے بعد میں نے پائپ سلگایا اور اس نے واسکٹ کی جیب سے ڈبیہ نکال کر نسوار منہ میں رکھی ۔کچھ دیر ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔اسی دوران میں اس نے ایک ملازم لڑکے کو ہمارے رات کے کھانے کی بابت کوہستانی زبان میں کچھ ہدایات دیں۔ابھی ہماری گفتگو جاری تھی کہ ایک بچہ اسے بلانے آ گیا۔ہم بھی ٹہلنے نکل گئے۔

عشاء کے وقت جب ہم کھانا کھانے آئے تو میں اس کے ہوٹل میں سیاحوں کا اژدہام دیکھ کر حیران رہ گیا۔عبدالقیوم نے بتایا کہ گل نبی کے ہوٹل کا کھانا دام مناسب ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت لذیذ بھی ہوتا ہے۔اس لئے سیر وتفریح کے لئے آنے والے وہ لوگ جو اس بات سے واقف ہیں' خواہ کسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہوں' کھانا یہیں کھاتے ہیں۔

کھانا واقعی بہت خوش ذائقہ تھا۔کھانے کے بعد قہوہ پینے میں گل نبی ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔خوب باتیں ہوئیں۔رات گئے جب ہم جانے کے لئے اٹھے تو ادائیگی کی کوشش کی ۔اس نے صاف انکار کر دیا۔کہنے لگا'' کیسا پیسہ؟ آپ تو ہمارا خاص مہمان ہے۔'' (کالام میں سیاحوں کے لئے ''مہمان'' کی اصطلاح رائج ہے' اس لئے ''خاص'' کے لفظ سے تخصیص پیدا کی گئی)۔میں نے بہت اصرار کیا لیکن وہ مان کر ہی نہ دیا۔

اگلے روز ہم ناشتے سے فارغ ہو کر ذرا دن چڑھے گل نبی کے پاس پہنچے۔چائے پیتے اور باتیں کرتے جب دوپہر ہونے لگی تو ہم جان بوجھ کر اٹھ کھڑے ہوئے ۔اس نے کھانے کے لئے روکنا چاہا تو میں نے کہا:''ہم ذرا اوشو ریسٹ ہاؤس تک جا رہے ہیں۔ممکن ہے آگے مٹیلتان تک ہو آئیں۔اس لئے آپ کھانے کا تردد نہ

کریں'' وہ بولا: ''جیسا آپ کا مرضی لیکن رات کے کھانے پر ضرور پہنچ جانا۔ میں نے شاہ نبی کے ساتھ دو اور لڑکوں کو ٹراؤٹ پکڑنے بھیجا ہے۔'' شاہ نبی اس کا چچا زاد بھائی تھا۔

اب رات کے کھانے پر نہ آنا کفرانِ نعمت بھی تھا اور گل نبی کے خلوص کی ناقدری بھی' لہٰذا پہنچے۔ بیٹھتے ہی ایک دلچسپ نظارہ دیکھنے کو ملا۔ پانچ چھ ایرانی نوجوان جو غالباً خیبر میڈیکل کالج پشاور کے طالب علم تھے' ایک آدھ پاؤ کی ٹراؤٹ مچھلی کو اچھالتے پھر رہے تھے۔ ان کا جوش و خروش کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ مچھلی پکڑنے کے چار پانچ یومیہ لائسنسوں کی فیس ادا کرنے' اتنی ہی بنسیوں کا کرایہ دینے اور سارا دن صرف کرنے کے بعد انھیں یہ ٹرافی ہاتھ لگی تھی۔ فارسی زبان میں ان کی فقرہ بازیوں اور چُہلوں سے میں خاص طور پر محظوظ ہو رہا تھا۔ جب وہ اس کھیل سے تھک گئے تو ان مستقبل کے سرجنوں نے نہایت انہماک سے اس ننھی سی مچھلی کا پوسٹ مارٹم شروع کیا۔ اس عمل کے دوران میں بھی ان کی نوک جھوک بڑی پُر لطف تھی۔ ابھی وہ فارغ نہ ہوئے تھے کہ گل نبی کے اشارے پر شاہ نبی کپڑے سے ڈھانپی ہوئی ایک چوبی کشتی ہمارے پاس لایا۔ اس میں کم و بیش آدھ آدھ سیر کی چھ ٹراؤٹ مچھلیاں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ ہم شاہ نبی کو اس کی مہارت پر خراجِ تحسین پیش کر ہی رہے تھے کہ ایرانی طلبہ کی نظر ان مچھلیوں پر پڑ گئی۔ وہ سب ایک ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو گئے اور ہمارے اردگرد آ کھڑے ہوئے۔ ان کا بیک زبان مطالبہ تھا کہ یہ مچھلیاں منہ مانگی قیمت پر انھیں فروخت کر دی جائیں۔ گل نبی نے معذرت کرتے ہوئے انھیں بتایا کہ یہ ہمارے ''خاص مہمانوں'' کے لئے ہیں۔ پھر بھی وہ پہلے تین' بعد ازاں دو اور بالآخر ایک مچھلی کے لئے اصرار کرتے رہے۔ تاہم انہیں مایوس ہونا پڑا۔ مجھے ان پر بڑا ترس آیا اور میرا جی چاہا گل نبی سے کہوں کہ تین مچھلیاں ان کو اچھے داموں فروخت کر دو۔ لیکن میرا اس موقع پر بولنا قطعاً نامناسب تھا۔

ٹراؤٹ اس سے پہلے بھی چکھی تھی اور بعد میں تو بیسیوں بار کھائی تھی لیکن گل نبی کے ہاتھ کی تلی ہوئی سالم ٹراؤٹ مچھلیوں کی لذت کو کوئی نہ پہنچ سکا۔ قہوے سے فارغ ہو کر میں نے اس سے کہا کہ کل تو ہماری دعوت تھی لیکن آج سے تمھیں کھانے کے پیسے وصول کرنا چاہئیں، آخر یہ تمھارا کاروبار ہے۔ بڑی بے نیازی سے ہنس کر بولا ''کل عبدالقیوم صاحب کا دعوت تھا، آج آپ کا۔ اور دعوت کا معاوضہ تو شاید دنیا کے کسی معاشرے میں رائج نہیں ہے۔'' میں پھر لاجواب ہو گیا۔ شب باشی کے لیے جائے قیام کی طرف لوٹتے ہوئے میں نے عبدالقیوم سے کہا: ''مفت خوری کا یہ سلسلہ بالکل غلط ہے۔ اس صورتِ حال کا کوئی مداوا سوچنا ہو گا۔''

اس سال، قیام کے دوران میں ہمارا یہ معمول ہو گیا کہ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر سیدھے گل نبی کے پاس جاتے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ اس کی دلچسپ باتوں سے لطف اندوز ہوتے۔ پھر ہائکنگ کی غرض سے کسی طرف نکل جاتے تو شام کو واپسی ہوتی۔ مغرب کے بعد کھانے کے لیے گل نبی کے ہوٹل پہنچ جاتے۔ یہ نشست زیادہ طویل اور بھرپور ہوتی اور اکثر رات گئے تک جاری رہتی۔ ہوٹل میں تیار ہونے والے کھانوں کے علاوہ وہ ہمارے آگے گھر پر تیار کردہ کوئی خاص مقامی کھانا بھی رکھتا: مثلاً پنیر کا سالن یا ایک خاص قسم کا ساگ جسے کوہستانی زبان میں ''سونچل'' کہتے ہیں۔ یہ ساگ ہمیں بڑا پسند آیا۔ رات کی اصل مجلس گاہکوں کا رش ختم ہونے کے بعد شروع ہوتی تھی۔ اسی وقت گل نبی کے قریبی دوست اپنی مصروفیات سے فارغ ہو کر وہاں چلے آتے۔ ان میں پڑھے لکھے بھی ہوتے اور ایسے بھی جو مالی اور سماجی اعتبار سے گل نبی کے مقابلے میں اونچی حیثیت کے مالک تھے۔ لیکن وہ سب ہر مسئلے اور معاملے میں اس کی رائے کو اہمیت دیتے تھے۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہوا کہ ہوٹل میں کام کرنے والے ملازمین کی نفری میں آئے دن ایک نیا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب بعد میں معلوم ہوا۔ گرد و نواح سے جو

شخص روزی کی تلاش میں کالام آتا اور اتفاقاً گل نبی سے دوچار ہو جاتا اسے کوئی مناسب کام ملنے تک کھانا اور چھت فراہم کرنا یہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ایک دن ایک ادھیڑ عمر کے اجنبی شخص کو دیکھ کر، جو ہوٹل میں کرسیاں سیدھی کر رہا تھا، میں رہ نہ سکا۔ میرے استفسار پر گل نبی مسکرا دیا اور بولا: ''یہ ادھر چترال سے اونچے اونچے پہاڑ عبور کر کے پیدل سفر کرتا ادھر آ نکلا ہے۔ ادھر اس کا کوئی واقفیت نہیں ہے---- اپنا قسمت لے گا' ہمارا کیا جاتا ہے؟'' سچ پوچھیے تو مجھے گل نبی کے سامنے اپنا آپ بہت حقیر معلوم ہوا۔

کچھ روز کے قیام میں مجھے گل نبی کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ اس کا آبائی تعلق سوات سے نہیں بلکہ انڈس کوہستان سے تھا۔ دریائے اباسین کے کنارے، موجودہ شاہراہ ریشم پر واقع قصبہ دبیر کے مضافات سے گل نبی کا دادا نقل مکانی کر کے کالام میں آ بسا تھا۔ پرانی رشتہ داریاں وہیں تھیں اور شادی غمی کے موقعوں پر آنا جانا اب بھی ہوتا تھا۔ ویسے یہ خاندان کالام میں پوری طرح رچ بس گیا تھا۔ کالام کی قدیم جامع مسجد کے عقب میں ذرا فاصلے پر گل نبی کا مکان تھا۔ شادی ہو چکی تھی اور اولادِ نرینہ میں غالباً دو بچے حضرت نبی اور احمد نبی تھے۔ دوسرے دوست نبی اور رحمت نبی بعد میں پیدا ہوئے۔

آمدنی کا مستقل وسیلہ تو تھا نہیں اس لیے معاش کی جستجو میں وہ مختلف ذرائع اختیار کرتا رہتا تھا۔ قناعت اور توکل علی اللہ کی صفات کے اعتبار سے وہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا نمونہ تھا۔ حالات کتنے ہی سخت اور پریشان کن ہوں، وہ کبھی مایوس نہیں ہوتا تھا اور نہ کوئی شکوہ شکایت زبان پر لاتا تھا۔ دین کی محبت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے وہ ایک دینی سیاسی جماعت کا کارکن بھی تھا۔ ایسا مخلص اور مستعد بلکہ جانثار کارکن جو کسی پارٹی کا بیش قیمت اثاثہ ہوتا ہے۔ شاید اسی مناسبت سے، پڑھا لکھا نہ ہونے کے باوجود، وہ حیرت انگیز سیاسی شعور کا مالک تھا۔ نسوار کھانے کے علاوہ

اس کا واحد شوق مختلف ملکی اور غیر ملکی ریڈیو سٹیشنوں بالخصوص بی بی سی، وائس آف امریکہ، وائس آف جرمنی اور ماسکو سے خبریں اور تبصرے سننا تھا۔ اسی غرض سے وہ ایک عمدہ ٹرانزسٹر ریڈیو ضرور رکھا کرتا تھا۔ لیکن ان سب باتوں سے قطع نظر میں سمجھتا ہوں کہ اس کا پیشہ کہو یا مشغلہ، صرف ایک ہی تھا اور وہ تھا خدمتِ خلق۔ اس خدمت سے اسے کبھی اور کہیں انکار نہ تھا۔ یہ خدمت خواہ نوعِ انسانی کی ہو یا ملّت اسلامی کی، ملکی ہو یا علاقائی گروہی ہو یا انفرادی وہ آٹھوں پہر اس کے لیے کمر بستہ رہتا تھا۔ مکانی اعتبار سے اس خدمت کے لیے کالام کی بستی یا (۱۹۶۰ء کی جنگ کے دوران) سندھ میں تھر پارکر کے محاذ تک کی کوئی قید نہ تھی۔

گل نبی سے ملاقات سے پہلے کالام میرے لیے محض سکون اور تفریح کی جگہ تھی۔ اب اس کی شخصیت کے باعث اس مقام میں کشش کی ایک نئی جہت پیدا ہو گئی تھی۔ اگلے سال جولائی کے مہینے میں جب ہم کالام پہنچے تو خالد ہوٹل کے باہر امیر شاہ نظر پڑا۔ اس کا تعلق بھی انڈس کوہستان سے تھا۔ میں نے پوچھا: ''گل نبی کا کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہے'' اس نے جواب دیا ''اب اس نے ہوٹل کا کام چھوڑ کر گیس سلنڈروں کی ایجنسی لے لی ہے۔''

''کہاں؟''

''وہیں پل کے پار والے بازار میں --- کالام ہوٹل کے داخلے کے بالکل سامنے''۔

ہم نے کمرے میں سامان رکھا اور اسے ملنے پہنچ گئے۔ وہ دکان کے سامنے کھڑا کسی آدمی سے بات کر رہا تھا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ دکان میں بٹھایا۔ چائے منگوائی۔ میں نے پوچھا: ''ہوٹل کا کام کیوں چھوڑ دیا؟''

جواب میں کہنے لگا ''ہوٹل میرا ذاتی تو تھا نہیں۔ ٹھیکے پر لیا ہوا تھا۔ اس سیزن

میں مالک نے ٹھیکے کی رقم بڑھا کر دوگنا کر دیا۔ اس کا ادائیگی میرے بس کی بات نہ تھی۔ یہ ایجنسی لے لی ہے۔ اللہ رازق ہے اور ہاں آپ ٹھہرے کہاں ہیں؟'' میں نے ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر بتایا تو کہنے لگا ''ٹھیک ہے۔ رات کا کھانا وہیں پہنچ جائے گا۔''

میں نے گھبرا کر کہا ''اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟ اب تمھارا ہوٹل تو ہے نہیں۔ گھر والوں کو تکلیف دینا اچھا نہیں لگتا۔''

ہنس کر کہنے لگا ''اس میں تکلیف کا کیا بات ہے؟ کھانا تو گھر میں پکتا ہے۔ پشاور سے بھی کئی مہمان گرمی کا موسم گزارنے آئے ہوئے ہیں۔ آپ لوگوں کے کھانے سے کیا فرق پڑے گا۔ بازار میں آپ کو اچھا کھانا بھی نہیں ملے گا۔''

پھر حسب سابق رات کا کھانا بالالتزام اور اگر ہم لوگ دن کو سیر کے لیے مضافات میں نہ نکلتے تو دوپہر کا کھانا بھی کمرے میں پہنچ جاتا۔ رات کی مجلس کا مسئلہ اس طرح حل ہوا کہ گل نبی اور اس کے بے تکلف دوست عشا کے بعد ہماری جائے قیام پر آ جاتے اور وہیں رات گئے محفل جمتی۔ مستقل حاضر باشوں میں عثمان غنی، استاد محمد علی (گورنمنٹ ہائی سکول، کالام) اور شاہ مدار (چیئرمین یونین کونسل کالام) شامل تھے۔ مقامی مسائل، سیاسی معاملات اور سماجی بہبود کے منصوبے زیر بحث آتے۔ اگر کبھی ہنسنے ہنسانے کا موڈ ہوتا تو عمر خطاب کو پکڑ لاتے جس کا کھانے کا ہوٹل اب خوب چلتا تھا۔ یہ سب مل کر اس کا گھیراؤ کرتے اور وہ اپنی حاضر جوابی کے بل بوتے پر چوکھی لڑتا۔ زیادہ تر کوہستانی میں باتیں ہوتیں اور تیکھے فقروں کا ترجمہ ہمارے لیے اُردو میں کیا جاتا۔ اس موقع پر مشہور مقولہ ''ہم دلی از ہم زبانی بہتر است'' کا مطلب صحیح معنی میں واضح ہوتا۔

جب آدھی رات ہونے کو آتی تو ہمیں آرام کا موقع دینے کی خاطر ان میں سے کوئی دوست کہتا ''چوئے'' (یعنی چلیں) اور یوں یہ پرلطف محفل اگلی شام تک کے لیے برخاست ہو جاتی۔ یہ سب مقامی دوست ہم لوگوں اور بالخصوص مجھ ہیچ میرز کا جو

احترام کرتے اور ہماری آسائش کی خاطر چھوٹی چھوٹی باتوں کا جس طرح خیال رکھتے اس پر مجھے بہت شرمندگی ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے ایک موقع پر ہم ماہوڈھنڈ (جھیل) پر مچھلی کے شکار کے لیے جا رہے تھے۔ راستے میں ایک بہت بڑا اور بے حد خوبصورت آبشار آتا ہے جس کا پانی سڑک پر سے بہہ کر دریا میں گرتا ہے۔ اسے پار کرنے کے لیے جب میں اپنے جاگرز کے تسمے کھولنے لگا تو استاد محمد علی نے مجھے باصرار ایسا کرنے سے باز رکھا اور اپنی پشت پر سوار کر کے یہ تیز رفتار دھارا عبور کروایا۔

گل نبی کی دکان پر گیس سلنڈروں کی فروخت تسلی بخش نہ تھی۔ جب لوگوں کو جلانے کے لیے لکڑی وافر مقدار میں قریب قریب مفت ملے تو وہ گیس پر پیسے کیوں ضائع کرتے۔ مجھے اس صورتِ حال پر تشویش ہوتی لیکن گل نبی کی قناعت پسند طبیعت پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔

آخر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا؛ اگلے موسم گرما میں کالام پہنچنے پر جب گل نبی کے بارے میں دریافت کیا تو پتہ چلا کہ وہ مینگورہ میں قیام پذیر ہے۔ وہاں کسی ہوٹل کا ٹھیکہ لے لیا ہے اور اہل خانہ بھی ساتھ چلے گئے ہیں۔ ایسا لگا جیسے ہم کسی بڑی نعمت سے محروم ہو گئے ہوں۔ گل نبی کی وساطت سے بنے ہوئے دوستوں نے بڑی آؤ بھگت کی لیکن ہمارا دل نہ لگا۔ بمشکل دو دن ٹھہرے اور پھر اس کا پتہ لے کر مینگورہ لوٹ آئے۔ عصر کے وقت ایک ہوٹل میں سامان رکھ کر اس کی تلاش میں نکلے۔ ہمیں دیکھ کر بڑا خوش ہوا لیکن مجھے اس کے چہرے سے اندازہ ہو گیا کہ اس بلبلِ حزیں کو آشیانے کی یاد ستا رہی ہے۔ اتنے بڑے شہر میں اس کی شخصیت گہنا سی گئی تھی۔ ہوٹل کے مالک کے ساتھ معاہدہ دو سال کا تھا۔ اس لیے آئندہ سال ہم نے زیادہ وقت وادی کاغان میں گزارا۔ صرف حاضری دینے کے لیے سوات گئے۔ اس بار وہ نسبتاً خوش نظر آیا۔ میں سمجھا شاید کام اچھا چل رہا ہے اس لیے مطمئن ہے لیکن اصل سبب یہ نہیں تھا۔ درحقیقت وہ گرمی

نشاطِ تصور سے نغمہ سنج تھا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا: ''اس سال ہمارا معاہدہ ختم ہو جائے گا۔ انشاء اللہ اگلے سیزن میں آپ سے کالام میں ملاقات ہو گی۔ ہوٹل کا مالک مجبور کر رہا ہے لیکن ہم اِدھر نہیں رہے گا۔ یہاں گرمی بہت ہے اور چشموں کا ٹھنڈا پانی بھی نہیں ملتا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔

آئندہ برس ہم امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا عازمِ سوات ہوئے۔ کالام پہنچنے پر جب گل نبی کے واپس آنے کی تصدیق ہو گئی تو اطمینان ہوا۔ پتہ چلا کہ اس نے سلنڈروں والی دکان میں بیکری کھول لی ہے۔ ہم پہنچے تو دکان پر شاہ نبی تھا۔ ملنے کے بعد بولا ''بھائی گھر گیا ہے۔ آپ بیٹھیں میں اسے بلا کر لاتا ہوں''۔

چند منٹ بعد ایک خوش و خرم گل نبی ہمارے سامنے موجود تھا۔ اس نے چائے منگوائی اور اپنی بیکری کی چیدہ چیدہ اشیا نکال کر پلیٹوں میں رکھیں۔ میں نے اتنی چیزیں نکالنے سے منع کیا تو بولا: ''آپ ذرا چکھ کر بتائیں کہ ان کا معیار صحیح ہے یا نہیں؟''

میں نے پوچھا ''یہ تمہیں بیکری کی کیا سوجھی؟''

جواب میں بولا ''ادھر کالام میں کوئی بیکری نہیں تھا۔ دکاندار مینگورا سے چیزیں لا کر بیچتے تھے جو باسی ہو جاتی تھیں۔ ہمارا ڈبل روٹی تو خوب بکتا ہے۔ بسکٹ بھی نکل جاتے ہیں۔ اللہ روزی رساں ہے۔ مال گھر کے قریب تیار ہوتا ہے اور فروخت کے لئے ادھر آ جاتا ہے۔''

''تمہیں بیکری کے کام کا تجربہ تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''تجربہ تو نہیں تھا۔ ایبٹ آباد کا ایک کاریگر مل گیا ہے۔ مزدوروں کی یہاں کمی نہیں۔ الحمدللہ کام چل رہا ہے۔''

دو سال سلسلہ منقطع رہنے کے بعد رات کی محفل آرائی پھر شروع ہو گئی تھی۔ گل نبی ان میں خوب چہکتا۔ اس کے دینی جذبے اور انقلابی خیالات کی بنا پر

سارے دوست اسے ''خمینی'' کہہ کر مخاطب کرتے۔ اس سال سے مقامی دوستوں کی جانب سے دعوتوں کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ یہ رات کے کھانے تک محدود ہوتیں۔ ہماری زحمت کے خیال سے کھانا اکثر ہماری جائے قیام پر ہی لایا جاتا اور سب مل کر کھاتے۔ کالام میں قیام کی آخری رات ہماری طرف سے تمام دوستوں کے اعزاز میں ضیافت کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا انتظام گل نبی کے ذمہ ہوتا تھا۔

اس بار ہمارے کالام جانے سے قبل وہاں ایک دلچسپ واقعہ رونما ہوا۔ غالباً جون کا مہینہ تھا۔ گل نبی نے بیکری کا کام نیا نیا شروع کیا تھا۔ پنجاب کے ایک بڑے شہر کی بلدیہ کے منتخب صدر (چودھری صاحب) جن کا تعلق ایک اہم سیاسی خاندان سے تھا' اپنے بیوی بچوں اور ملازموں کے ساتھ کئی گاڑیوں پر مشتمل قافلہ لے کر کالام پہنچے۔ بیکری کے سامنے کالام ہوٹل میں آمنے سامنے کمروں کی دو قطاریں ریزرو کرا کے پردے کی خاطر قناتیں لگا دی گئیں۔ رات کو کمروں کے درمیان کھلے پلاٹ میں وی۔سی۔آر پر فلم چلائی گئی۔ گاؤں کے بچوں نے اوپر سے جو یہ نیا تماشا دیکھا تو جوق در جوق پہنچ گئے اور آدھی رات تک تصویریں دیکھنے کے شوق میں تصویرِ حیرت بنے رہے۔ اُدھر گھر والے اپنے بچوں کی تلاش میں ہلکان ہوتے رہے۔ قناتوں کے اندر داخل ہونا اور اس جمِ غفیر میں بچوں کا ڈھونڈھنا ممکن نہ تھا۔ غرض ایک ہنگامہ برپا رہا۔ گل نبی گھر پر بیکری کا مال بنوانے میں مصروف تھا۔ اسے نمازِ فجر کے وقت اس واقعے سے آگاہی ہوئی۔ دن نکلتے ہی غصے میں بھرا ہوا دکان پر آیا۔ اتفاق سے چودھری صاحب صبح کی سیر کے لئے ہوٹل سے نکل رہے تھے۔ گل نبی نے آواز دے کر بلایا اور دونوں میں مکالمہ ہوا:

''چودھری صاحب! یہ کنجر خانہ ادھر نہیں چلے گا؟''

''کیسا کنجر خانہ؟''

''یہ جو رات کو آپ نے پورے گاؤں کو مصیبت میں مبتلا رکھا' اس کا ذمہ دار

کون ہے؟''

چودھری صاحب نے پہلے تو رعب جمانا چاہا لیکن جب دیکھا کہ معاملہ دگرگوں ہے تو ٹھنڈے پڑ گئے۔

''بھائی! بات یہ ہے کہ میں تو اول رات ہی سو گیا تھا۔ یہ میری بیگم کا شوق ہے۔ اب میں اسے کیا کہوں؟''

چودھری صاحب خفیف ہو کر بولے۔

''آپ تو بیگم صاحب سے ڈرتا ہوگا' ہم نہیں ڈرتا۔ یہ حرکت آئندہ نہیں ہونی چاہیے۔'' گل نبی نے انتباہ کیا۔

''یار میں تو سیر کو جارہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں بیگم صاحبہ ڈبل روٹی وغیرہ لینے خود آئیں گی' تم ان کو سمجھا دینا۔'' چودھری صاحب نے ہار مانتے ہوئے کہا اور جب بیگم صاحبہ آئیں اور گل نبی نے انھیں کھلے الفاظ میں تنبیہہ کی تو وہ تڑخ کر بولیں: ''کیوں نہیں لگ سکتا وی۔سی۔آر؟ کیا یہ پاکستان نہیں ہے؟''

''پاکستان تو ہے مگر آپ کے پاکستان والا قانون اِدھر نہیں چلتا۔ آپ اپنے کمرے میں ہروقت وی۔سی۔آر لگائیں لیکن باہر کھلی جگہ پر لگانے کی اجازت آپ کو نہیں مل سکتی' آپ یہاں تفریح کے لئے آئی ہیں یا ہمارے بچوں کو بگاڑنے؟'' گل نبی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

بیگم صاحبہ نے کچھ سامان خریدا اور خاموشی سے لوٹ گئیں۔ بعد میں چودھری صاحب سے ذکر ہوا تو انہوں نے بھی سمجھایا کہ معاملہ بے ڈھب ہے اور احتیاط لازم۔

بہرحال خود چودھری صاحب پر اس واقعے نے عجیب اثر کیا۔ ان کی ساری عمر حکم دیتے اور منواتے گزری تھی۔ وہ ایک مقتدر شخص تھے اور ان سے بڑی مقتدرہ صرف ان کی بیگم تھیں۔ آج بظاہر ایک معمولی سے شخص نے انھیں جس انداز سے ٹوکا تھا یہ ان

کے لئے ایک انوکھا تجربہ تھا۔آدمی صاف دل تھے۔بجائے ناراض ہونے کے گل نبی کے عقیدت مند ہو گئے۔جتنے دن ٹھہرے زیادہ وقت بیکری پر اس کی صحبت میں گزارا۔اپنی سیاسی پارٹی کے کارناموں پر گل نبی کے طنز سنتے اور ہنستے۔بار بار گل نبی کو پنجاب آنے کی دعوت دیتے اور گل نبی جواب میں کہتا ''چودھری صاحب! میں مزدور آدمی ہوں۔آپ کی طرح میرے پاس بلدیہ کا ہوائی مال نہیں ہے۔میں اپنے بچوں کے لئے روزی کماؤں یا آپ کے پاس آ کر اپنا وقت ضائع کروں۔''

چودھری صاحب چند دن ٹھہر کر واپس چلے گئے لیکن وہ گل نبی کو بھول نہ سکے۔خطوں کے ذریعے اس کی خیریت معلوم کرتے اور اپنے پاس بلاتے۔گل نبی پر اثر نہ ہوتا دیکھ کر انھوں نے ایک ترکیب نکالی۔کسی ذریعے سے پیغام بھیجا کہ میں سخت بیمار ہوں۔ایک بار مجھے مل جاؤ۔گل نبی اس بھ ِ ے میں آ گیا۔منزل پر پہنچا تو چودھری صاحب اس کامیابی پر بڑے خوش ہوئے۔وُہ اس کے قدردان تو تھے ہی اس کے ساتھ نہایت اہم شخصیت کا سا برتاؤ کیا۔خوب گھمایا پھرایا۔اپنی املاک و جائیداد دکھائی۔ایسے پرتصنع ماحول میں گل نبی کا دل کیا لگتا۔ہر روز جانے کی اجازت طلب کرتا۔آخر کئی دن بعد چودھری صاحب اسے رخصت کرنے پر آمادہ ہوئے۔اس کے روانہ ہونے سے ذرا پہلے تنہائی میں ایک بریف کیس اس کو تھماتے ہوئے کہنے لگے ''گل نبی! تم مجھے بہت عزیز ہو۔اس بریف کیس میں ایک لاکھ روپیہ ہے۔اس کی میرے اور تمھارے سوا کسی کو خبر نہیں ہے اور نہ آئندہ ہو گی۔تم یہ لے جاؤ اور اس سے کوئی کاروبار کر لو۔''

گل نبی کا ردِعمل اس کے کردار کے عین مطابق تھا۔وہ بڑے وقار سے بولا ''چودھری صاحب! میں غریب ضرور ہوں لیکن خدا سے مانگتا ہوں بندوں سے نہیں مانگتا۔'' چودھری نے بہتیری کوشش کی لیکن یہ عنقا زیرِدام آنے والا نہیں تھا۔وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا کہ ''چودھری صاحب! آپ نے تو مجھے پہچانا ہی نہیں۔''

اگلی بار جب کالام پہنچ کر ہم نے گل نبی کا پتہ کیا تو شاید عثمان غنی نے بتایا کہ ''وہ چودھری آیا ہوا ہے۔ ہوٹل میں ٹھہرا ہے' گل نبی اس کے پاس بیٹھا ہوگا۔'' میں اس ہوٹل پہنچا۔ استقبالیہ سے معلوم کر رہا تھا کہ قریبی کمرے سے گل نبی میری آواز سن کر نکل آیا۔ معانقے کے بعد کہنے لگا ''میں ذرا چودھری کو بتا دوں' پھر چلتے ہیں۔'' واپس آ کر بولا ''آپ ذرا کمرے میں آئیں۔ چودھری آپ سے ملنا چاہتا ہے۔'' میں اس کے ساتھ کمرے میں گیا۔ چودھری صاحب تہمد اور بنیان میں پلنگ پر نیم دراز تھے۔ گل نبی نے شاید میرا تعارف کرا دیا تھا۔ سلام دعا اور مزاج پرسی کے ساتھ ہی کہنے لگے ''پروفیسر صاحب! اس کو ذرا سمجھائیں' اس کو تو کاروبار کی الف بے کا بھی پتہ نہیں ہے۔ اب کالام میں بیکری چلا رہا ہے اور ڈبل روٹی مینگورہ کے نرخ پر بیچتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ دوگنے داموں پر بھی فروخت کرے تو لوگ لیں گے۔ لوگ یہاں سیر کرنے اور پیسہ خرچنے کے لئے آتے ہیں۔ انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا.....''

اس موضوع پر بحث شروع ہوگئی۔ گل نبی کا کہنا تھا کہ ''میں لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا۔ اگر لوگ تفریح کے لئے آ ہی جاتے ہیں تو کیا ان کے کپڑے اتار لئے جائیں۔''

یہ مباحثہ خاصی دیر چلتا رہا۔ بیچ بیچ میں ایک دوسرے کی سیاسی جماعت پر حملے بھی ہوتے رہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ سچے تھے۔ میں دونوں کی ہاں میں ہاں ملاتا اور بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ اچانک چودھری صاحب نے مجھے مخاطب کیا ''دیکھیں جی! میں تو یہ سب کچھ اسی کے بھلے کو کہتا ہوں اور سچ پوچھیں تو میں اتنی دور محض اس شخص کی محبت میں آتا ہوں ورنہ مری ہم سے قریب ہے اور وہاں ہمیں ہر طرح کی آسائش میسر ہے۔ اب اگر یہ میرا مشورہ قبول نہیں کرتا تو اس کی مرضی۔''

دراصل بیکری کا کام گل نبی کے بس کا روگ نہ تھا۔ ایک تو قیمتیں اتنی مناسب

جس میں نفع کا امکان کم تھا۔ دوسرے اشیا کی تیاری میں مطلوبہ اجزا میں سے کوئی چیز معیار سے کم یا مشکوک ہوتی تو اس کو فوراً ضائع کر دیا جاتا اور سب سے بڑھ کر گل نبی کا جذبۂ مسافرنوازی کہ کام چلانے کے لئے جتنے کارندے ضروری تھے اس سے کہیں زیادہ آدمی لگائے رکھتا کہ ان کی روزی کا وسیلہ بنا رہے۔ یوں بھی کالام میں کاروبار کا سیزن صرف تین ماہ کا ہوتا ہے جب میدانی علاقوں میں شدت کی گرمی پڑتی ہے۔ بہرطور بیکری والا سلسلہ تین برس جاری رہ سکا۔ تیسرے اور آخری سال میں' جو جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ۱۹۸۸ء تھا' گل نبی نے ایک اضافی کام کا آغاز کیا۔ یہ تھا جائیداد کی خرید و فروخت کا کاروبار جو بیکری کے بعد اس کا کل وقتی شغل قرار پایا۔ یہ کام ہر لحاظ سے اس کے لئے موزوں تھا۔ ایک تو پورے علاقے میں اس کی راست بازی' دیانت داری اور ہمدردی مسلمہ حیثیت رکھتی تھی۔ دوسرے اس وقت تک سوات اور بالخصوص کالام ملکی اور غیر ملکی سیاحوں میں اتنا معروف و مقبول ہو چکا تھا کہ یہاں کے ہوٹلوں میں گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس طلب کے نتیجے میں نئے ہوٹلوں کی تعمیر میں تیزی سے سرمایہ کاری ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان کی تعمیرات کے لئے پہلا قدم زمینوں کی خریداری ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں ہر پلاٹ خریدنے والے اور فروخت کرنے والے کو گل نبی کی ضرورت پڑتی تھی۔ اکثر سودے اسی کی وساطت سے طے پاتے تھے اور کمیشن کی صورت میں اسے معقول یافت ہو جاتی تھی۔

اس کے شیدائی چودھری صاحب نے بھی سڑک کے کنارے ایک بڑا پلاٹ خریدا۔ اب گل نبی نے مہمانوں کے لئے اپنے گھر کے ساتھ ایک کشادہ بیٹھک بنوائی جس کے ساتھ ملحقہ غسل خانہ بھی تھا۔ بیٹھک کی چھت اور دیواروں پر لکڑی کا بڑا خوبصورت کام کیا گیا تھا۔ چند سال کے عرصے میں جب اس کے مالی حالات ذرا بہتر ہوئے تو وہ چھوٹے موٹے تعمیراتی ٹھیکے لینے لگا۔ یہ کام بھی وہ نہایت ذمہ داری اور دیانت

داری کے ساتھ کرتا تھا۔ چودھری صاحب کی عالی شان کوٹھی بھی اس کی نگرانی میں مکمل ہوئی۔ اس کی آرائش وزیبائش اور تنصیبات دیکھ کر گل نبی کے ذوق کی داد دینا پڑتی تھی۔ اس کوٹھی کے ساتھ ہی اس نے اپنا خوش نما دفتر تعمیر کیا اور اس میں ٹیلی فون لگوایا۔

کالام میں تعمیراتی پتھر کی فراہمی دقت طلب تھی اور اینٹیں مردان سے لائی جاتی تھیں جو ظاہر ہے بڑی مہنگی پڑتی تھیں۔ گل نبی نے کالام میں مقامی پہاڑی ریت دریافت کر کے اس سے تیار کردہ بلاک متعارف کرائے۔ آرائشی پتھر مینگورہ کی کانوں سے منگوایا جاتا تھا۔ مجھے اس کی معاشی حالت کی بہتری پر بے پناہ مسرت ہوتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس مرفہ الحالی سے اس کے اخلاق عالیہ میں کسی قسم کی کمی واقع ہونے کی بجائے اضافہ ہوگیا تھا۔

سیاحت کے بھرپور سیزن میں ہوٹلوں میں جگہ کم پڑ جاتی اور شام کے بعد تو سر چھپانے کی جگہ ملنا ہی ناممکن تھا۔ ایسے میں اگر کوئی خاندان گاڑی خراب ہوجانے یا کسی اور مجبوری کے باعث رات گئے کالام پہنچتا اور کسی طرح گل نبی کو خبر ہو جاتی تو نو واردین کے کھانے اور رات بسر کرنے کا اہتمام وہ اپنا خوش گوار فریضہ سمجھتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ دن کے وقت بھی اس کے دفتر میں مختلف چھوٹے چھوٹے مسائل کے حل میں امداد طلب کرنے والے سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ہر آنے والے کی قہوہ سے تواضع کی جاتی۔ بعض اوقات تو یہ بن بلائے مہمان ایسی معمولی باتوں کی شکایات لے کر آتے کہ ہم لوگوں کو غصہ آتا مگر میں نے کبھی نہ دیکھا کہ گل نبی کے ماتھے پر شکن پڑی ہو۔ وہ اپنے سارے کام چھوڑ کر بڑی خندہ پیشانی سے ان کے ساتھ چل پڑتا یا کسی کو بھیج دیتا۔

مقامی سماجی بہبود کے کاموں میں بھی اس کی دلچسپی میں کوئی کمی نہ آئی۔ کالام کی تاریخی جامع مسجد خستہ ہو چکی تھی۔ اس کی تعمیرِ نو میں اس نے بھرپور حصہ لیا۔ اسی طرح آبادی زیادہ پھیل جانے کے باعث جب گل نبی کی جماعت نے ایک نئی جامع مسجد اور

اس کے ساتھ دارالعلوم تعمیر کرنے کا ڈول ڈالا تو اس نے رضاکارانہ طور پر دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ اینٹیں اور مسالہ ڈھونے کا کام انجام دیا۔

میں نے گل نبی کی انسانی ہمدردی کے بہت سے مظاہر کا مشاہدہ کیا ہے۔ دو ایک معمولی لیکن درحقیقت بڑی اعلیٰ مثالیں یہاں درج کرتا ہوں۔

ایک دن ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے پُل سے اس کے دفتر کی جانب جا رہے تھے۔ اچانک وہ مجھے چھوڑ کر آوازیں لگاتا ہوا تیزی سے بھاگا۔ خاصے فاصلے پر نیچے دریا کے کنارے تفریح کی غرض سے آیا ہوا ایک خاندان فوٹو کھینچ رہا تھا۔ گل نبی ان کے پاس پہنچ کر کچھ دیر سمجھاتا رہا۔ پھر چڑھائی چڑھ کر واپس سڑک پر آ گیا۔ میں نے اس سے اس اضطراب کا سبب دریافت کیا۔

ماجرا یہ تھا کہ اُچھلتے اور جھاگ اُڑاتے پہاڑی دریاؤں میں کچھ پتھر ابھرے ہوئے ہوتے ہیں جو ہر وقت پانی سے شرابور رہنے کی وجہ سے اتنے چکنے ہو جاتے ہیں کہ ادھر کسی نے پاؤں رکھا اور ادھر پھسل کر موت کی یخ بستہ وادی میں پہنچا۔ لاعلم سیاح فوٹو گرافی کے شوق میں کنارے سے قریب واقع پتھروں پر چھلانگ لگا کر جانے کی کوشش کرتے ہیں اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ایسی کئی اموات میرے علم میں بھی تھیں۔ گل نبی نے دور سے دیکھ لیا کہ اس خاندان کا ایک فرد کیمرہ تھامے پتھر پر چھلانگ لگایا ہی چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جیسا شخص ایسے موقع پر کس طرح خاموش رہ سکتا تھا۔

۱۹۸۵ء کا ذکر ہے، کالام میں ہمارے قیام کا آخری دن تھا۔ سہ پہر کے وقت ہوٹل کی تیسری منزل پر اپنے کمرے میں ستا رہے تھے کہ زبردست بھونچال آیا۔ شدّت کا یہ عالم تھا کہ زینے سے اترتے ہوئے قدم جمانا محال ہو گیا۔ نیچے کھلی جگہ پر قریبی عمارتوں اور دکانوں سے لوگ نکل کر جمع ہو چکے تھے۔ وادی میں اردگرد کے

پہاڑوں سے پتھر لڑھک رہے تھے' مٹی کے تودے جھڑ رہے تھے اور ان کی دھول اڑ رہی تھی۔ ہوٹل کی عمارت میں دراڑیں پڑ گئیں۔ قیامت کا سا سماں تھا۔ ہر طرف اذانوں کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس نفسا نفسی کے عالم میں میری نظر گل نبی پر پڑی جو بڑی بے تابی کے ساتھ اس ہجوم میں ہمیں تلاش کر رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی تھا زلزلے کے پہلے جھٹکے کے ساتھ ہی ہماری طرف دوڑ پڑا تھا۔ ہمیں زندہ سلامت دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بے ساختہ کہنے لگا ''آج ہم اس ہوٹل میں نہیں ٹھہرے گا۔'' اس مختصر سے جملے میں لفظ ''ہم'' اپنائیت کی جس انتہا کا آئینہ دار تھا۔ اس سے مجھے غالب کا یہ شعر یاد آ گیا:

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے   غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اس نے فوراً ہی ہمارا سامان ایک' یک منزلہ ہوٹل میں منتقل کر دیا۔

تعلیم حاصل نہ کر سکنے کے باعث گل نبی بعض اوقات کسی انگریزی لفظ کے تلفظ میں کوئی بے ضرر اور معصوم سی ترمیم کر دیتا تھا جس سے مجھے بڑا لطف آتا تھا۔ مثلاً لفظ ''پرابلم'' کو وہ ہمیشہ ''پراگلم'' کہا کرتا تھا۔ جب ہم نے پہلی بار اس سے یہ تلفظ سنا تو ہمارے ایک ساتھی کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ممکن ہے وہ گل نبی کی تصحیح کر بیٹھتا لیکن میں نے آنکھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔

ایک موقع پر جب میں اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ کالام پہنچا تو میں نے گل نبی سے کسی ایسے ہوٹل میں ٹھہرانے کی درخواست کی جو ذرا الگ تھلگ اور پُر سکون جگہ پر ہو۔ شاہ نبی نے ایک نو تعمیر ہوٹل اور اس کے مالک کا نام لیا۔ گل نبی نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا ''ہاں وہ ہے مردان کا سنوڑی والا۔'' میں سمجھا کہ ''سنوڑی'' ضلع مردان میں ہوٹل کے مالک کا گاؤں ہوگا۔ دو تین روز بعد اتفاقاً انکشاف ہوا کہ اس نئے ہوٹل کے مالکان کا پہلے بھی کالام میں ''سنو ڈیو'' (Snow Dew) نام کا ایک ہوٹل

موجود ہے۔ظاہر ہے کہ میں اس بات پر بڑا محظوظ ہوا۔

انگریزی الفاظ کے علاوہ بعض اردو محاورات کے محلِ استعمال میں تسامح سے بھی کچھ لطائف سرزد ہوتے تھے۔ جب حضرت نبی کالام ہائی سکول سے میٹرک پاس کر کے گورنمنٹ کالج مٹہ میں داخل ہوا تو اس کے اردو نصاب کی کتاب میں میرے والد مرحوم کی بھی کوئی نظم شامل تھی۔ اس ضمن میں وہ مجھ سے گفتگو کر رہا تھا کہ اچانک گل نبی نے سوال کیا ''جب آپ کا والد فوت ہوا تو آپ کتنا بڑا تھا؟'' میں نے جواب دیا ''بارہ سال کا۔'' اس پر اس نے بڑی دل سوزی سے کہا ''سبحان اللہ'' اور میں مسکرا کر رہ گیا۔

کالام کی آبادی میں وسعت' تعمیرات اور سیاحوں کی بہتات سے نہ صرف گل نبی بلکہ ساری مقامی آبادی کا روزگار وابستہ تھا لیکن میری طرح اس کے مزاج میں بھی وحشت کا عنصر موجود تھا۔چنانچہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اب کالام میں اطمینان و سکون ختم ہو رہا ہے اور ہنگاموں کے ساتھ ساتھ آلودگی بھی بڑھ گئی ہے۔ مجھ سے کہتا کہ اگر صحیح معنوں میں یہاں کا لطف اٹھانا ہے تو برفباری کے موسم میں آؤ۔کبھی پکنک منانے یا ٹراؤٹ کا شکار کھلنے کے لئے ماہوڈھنڈ جانا ہوتا تو بہت خوش رہتا۔اس کا ارادہ تھا کہ گرمی کے موسم میں یہاں مستقل قیام کی کوئی صورت نکالی جائے۔ایک صدمہ اس کو جہادِ افغانستان میں حصہ نہ لے سکنے کا تھا۔کئی بار تیاری کی لیکن کوئی نہ کوئی اڑچن پڑ گئی۔

اب گل نبی کے دونوں بڑے لڑکے باپ کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لائق ہو گئے تھے۔ مہینے میں ایک آدھ بار ہم لوگ فون پر ایک دوسرے کی خیریت معلوم کر لیتے تھے۔ جون ۱۹۹۸ء کے وسط میں ایک شدید گرم دوپہر کو میں نے کالام میں گل نبی کے دفتر کا نمبر ملایا۔احمد نبی نے فون اٹھایا۔میں نے پوچھا ''سب ٹھیک ہیں؟''

''ہاں سب تو ٹھیک ہیں لیکن ابا ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیوں کیا بات ہے؟''

''اس کے گردوں میں تکلیف ہے۔''

''علاج ہو رہا ہے؟''

''ہاں! مینگورہ ہسپتال میں داخل ہے۔''

''اس کے پاس کون ہے؟''

''حضرت نبی اور تازہ گل اور بہت لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔''

میرا جی چاہتا تھا کہ اڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں لیکن لاہور کے ایک ہسپتال میں میری اہلیہ کا ایک بڑا آپریشن ہونے والا تھا۔ دو روز کے بعد میں نے پھر فون کیا تو معلوم ہوا کہ گل نبی کے گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے اور اسے مینگورہ سے پشاور لے جا رہے ہیں۔ لیکن مشیتِ الٰہی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس سخت گرمی میں اس کا دل سوات چھوڑنے پر آمادہ بھی نہ ہوا ہوگا۔ جس دن پشاور جانا تھا اس سے پہلی رات وہ دیر تک دوستوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا۔ ۱۸- جون کو علی الصبح اس نے اپنے تیمارداروں کو الوداع کہا اور مسکراتے ہوئے جان جاں آفریں کے حوالے کر دی۔

جولائی کے مہینے میں جب میں کالام پہنچا تو ہر چیز پر ویرانی چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور غالب کا یہ شعر جیسے میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا:

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد — مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

کالام کے گاؤں کی عقبی پہاڑی پر واقع پرانے گورستان میں چڑھائی ختم ہوتے ہی' ایک چوبی کٹہرا نظر پڑتا ہے۔ یہاں ایک ایسا شخص اپنی والدہ کے پہلو میں محوِ خواب ہے جس کی سیماب صفت زندگی' کسی نسلی اور لسانی عصبیت کے بغیر بنی آدم سے بے ریا محبت اور ان کی بے لوث خدمت میں بسر ہوگئی۔

چک ۱۷ کا شریفا

مارچ ۱۹۸۴ء کی ساتویں تاریخ تھی۔کئی ہفتے سے لاہور کے چھوٹے بڑے کام جمع ہو گئے تھے۔ میں کالج سے چھٹی لے کر صبح ہی لاہور چلا گیا۔نمٹتے نمٹاتے دن گزر گیا۔رات نو بجے کے قریب گھر پہنچا۔گھر میں قدم رکھتے ہی ایک عزیز نے بتایا''رات بابا شریفا فوت ہو گیا۔آج شام کو دفنایا ہے۔''میں اس اچانک خبر کے لیے تیار نہ تھا۔سناٹے میں آ گیا۔چند لمحے بعد بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔''آج گاؤں رنڈوا ہو گیا۔''

مجھے شریفے کی بیماری کی کوئی اطلاع نہ تھی۔اس کی موت کا یقین ہی نہ آتا تھا۔ایسی ہنگامہ پرور زندگی گزارنے والا آدمی اور اس خاموشی سے چل دے! جیسے کوئی زرد پتہ کسی ٹہنی سے جھڑ جاتا ہے۔شریفے کا بھرا بھرا چہرہ اور گٹھا ہوا جسم میری نظروں میں مجسم ہو گیا۔کانوں میں اس کی پاٹ دار آواز گونج رہی تھی۔عمر بھی ساٹھ سے ادھر ہی ہو گی۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ کبھی بیمار ہو کر چارپائی پر لیٹا ہو۔معمولی بخار وخار کو تو وہ خاطر ہی میں نہ لاتا تھا۔آخر اسے ہو کیا گیا؟

میرا دستور ہے کہ اختتامِ ہفتہ پر گاؤں چلا جاتا ہوں۔رات کو گاؤں کے لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور آدھی آدھی رات تک محفل جمی رہتی ہے۔ ہفتے بھر کی تھکن اتارنے کے لیے یہ محفل جادو کا اثر رکھتی ہے۔اعصاب تازہ ہو جاتے ہیں۔کبھی کسی مصروفیت کے باعث جانا نہ ہو تو اگلا ہفتہ گزارنا دوبھر ہو جاتا ہے۔شریفا ان محفلوں کی جان

تھا۔اتفاق سے پچھلے ہفتے بعض مہمانوں کی آمد کے سبب میں گاؤں نہ جا سکا تھا۔بس انھی دنوں میں وہ بیمار ہوا اور چل بھی دیا۔

ایک کرب انگیز رات گزار کر صبح میں گاؤں پہنچا۔شریفے کے کچے مکان کے آگے صفِ ماتم بچھی تھی۔گاؤں کے چند عمر رسیدہ افراد اور مرحوم کے اعزہ بیٹھے تھے۔مجھے آتا دیکھ کر اس کا چھوٹا بھائی بشیرا مجھ سے لپٹ گیا اور سسکیاں لیتے ہوئے بولا ''چودھری! تیرا یار چلا گیا۔'' رسمی دعا سے فارغ ہو کر میں نے بشیرے سے شکوہ کیا ''تم نے مجھے شریفے کی بیماری کی خبر بھی نہ کی!''

''چودھری! وہ ایسا بیمار بھی کہاں ہوا۔دو روز پہلے رات کو سینے میں درد کی شکایت کی۔مولوی کی دکان سے درد کی گولی لے کر اسے کھلا دی۔اگلے دن ٹھیک رہا مگر رات کو پھر وہی درد اٹھا۔صبح میں اسے شہر لے گیا۔ڈاکٹر سے دوا لی۔پاس ہی ایک سکول تھا۔مجھ سے کہنے لگا ''کیا چودھری اس سکول میں پڑھاتا ہے؟'' میں نے کہا ''اس کا سکول تو بہت دور ہے۔شہر کے دوسرے سرے پر۔'' کہنے لگا ''مجھے اس سے ملا دو'' میں نے کہا ''تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔گاؤں چلتے ہیں۔چودھری کو پیغام بھیج دیں گے۔وہ خود آ جائے گا''۔پھر راستے میں کہنے لگا ''بشیرے میں بچوں گا نہیں۔اگر چودھری سے میری ملاقات نہ ہو سکے تو اسے میری طرف سے کہہ دینا کہ وہ کوئی کتاب بنائے تو اس میں میری باتیں بھی لکھ دے'' میں نے کہا ''یہ تو میں کہہ دوں گا لیکن تم ایسے کون سے بیمار ہو۔درد ہو ہی جاتا ہے۔ڈاکٹر کی دوا سے ٹھیک ہو جائے گا''۔رات سب گھر والے اس کے پاس تھے۔آدھی رات سے ذرا پہلے وہ چوکنا ہو کر بولا ''اچھا اب میں چلتا ہوں۔ضرورت مندوں کے کام آنا اور حویلی کے کتوں کو روٹی ڈالتے رہنا'' بس اتنا کہہ کر قبلے کی طرف رخ کیا اور دم دے دیا۔''

شریفے نے بڑی بھرپور زندگی بسر کی۔اس کا تعلق اس چک میں آباد ہونے

والوں کی دوسری نسل سے تھا۔رواں صدی کے اوائل میں جب دوآبہ رچنا کی زمینیں نہروں سے سیراب ہوئیں تو ایک مربعہ فی خاندان کے حساب سے آبادکاری کی گئی۔شریفے کے باپ بابا محمد دین کو بھی ایک مربعہ زمین ملی۔اس چک کے آبادکاروں کا تعلق ضلع سیالکوٹ سے تھا۔اب بھی ان کے اکثر رشتے ناتے ان کے آبائی دیہات ہی میں طے پاتے ہیں۔صدیوں کی پیاسی زمینوں کو جب پانی ملا تو ان میں فصلیں لہلہا اٹھیں۔یوں بھی زندگی سادہ تھی اور کسانوں کی ضروریات محدود۔نوآباد گھرانے خوشحال ہو گئے۔لیکن یہ آسودگی تادیر قائم نہ رہ سکی۔سیم نے سرطان کی طرح زمین میں پنجے گاڑ دیے۔شریفا جوان ہوا تو اس کے باپ کی زمین غلے کی بجائے کلر اگلتی تھی۔بہت سے لوگ گاؤں چھوڑ کر ساہیوال اور ملتان کی طرف نکل گئے۔جن خاندانوں کے افراد زیادہ اور گزارہ مشکل تھا وہ محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنے لگے۔شریفے کا بڑا بھائی محکمہ انہار میں ڈاکیہ ہو گیا۔دو چھوٹے بھائی، باپ کے ساتھ زمین کے ان مختصر ٹکڑوں پر قسمت آزمائی کرتے جو ابھی پوری طرح سیم کی لپیٹ میں نہیں آئے تھے۔خود شریفا نہری ٹھیکیداروں کے کام پر مٹی کھودتا اور ٹوکری ڈھوتا۔لیکن یہ کام مستقل تو تھا نہیں اس لیے موسمی پھل اور سبزیاں ٹوکرے میں ڈال کر سر پر رکھتا اور اردگرد کے دیہات میں بیچ آتا۔پھر لاہور جا نکلا اور چند سال محلے محلے سبزی بیچتا رہا۔بال بچے گاؤں میں تھے لیکن لاہور سے روز آنا ممکن نہ تھا۔ہفتے دو ہفتے میں چکر لگاتا۔نوگزے کے چوک کے قریب ایک چھوٹی سی کوٹھڑی لے رکھی تھی۔رات وہاں پڑ رہتا۔

اوائل عمر ہی میں محنت مشقت کی وجہ سے شریفے کا جسم بڑا مضبوط تھا۔قد تو سوا پانچ فٹ سے زیادہ نہ ہو گا لیکن چوڑے چکلے ہاڑ اور بھرا بھرا جسم اسے مجمع میں بھی نمایاں کرتے تھے۔باپ کے مرنے کے بعد گول کترواں ڈاڑھی رکھ لی تھی جو شیر کی ایال معلوم ہوتی تھی۔پڑھا لکھا مطلق نہ تھا لیکن زندگی کے بے رحم تجربات نے اسے عقلمند بنا

دیا تھا۔ کبھی کبھی تو ایسی حکیمانہ باتیں کرتا کہ میں اس کا منہ تکتا رہ جاتا۔ یہ اس کی عظمت تھی کہ اتنی صعوبتیں سہنے کے باوجود زندگی کے بارے میں اس کا رویہ بڑا مثبت اور تعمیری تھا۔ وہ بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔ اس سونے پر سہاگا اس کا ہنسی مذاق۔ ان سب باتوں نے مل کر اسے ہر مجلس اور ہر طبقے میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ جو عمر میں اس سے چھوٹے ہوتے انھیں گالیاں بھی خوب دیتا۔ وہ گالیاں سنتے اور ہنستے۔ مجال ہے کبھی کسی نے اس کی بات کا برا مانا ہو۔

جن دنوں لاہور میں رہتا تھا، چوک نوگزے سے صبح سبزی بیچنے نکلتا۔ ساتھ ہی اربابِ نشاط کا محلّہ تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں پورا محلّہ بابا شریفے کا گرویدہ ہو گیا اور سبزی کی رسد پر شریفے کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ بعد میں مجھے بتایا کرتا تھا کہ "چودھری یہ بہت دکھی ہوتی ہیں اور اپنے ماں باپ کا نام پتہ کسی صورت میں بھی نہیں بتاتیں۔"

باپ کی موت کے بعد شریفا زیادہ عرصے گاؤں سے دور نہ رہ سکا۔ بڑا بھائی شہر میں محکمۂ نہر کی کالونی میں جا بسا تھا۔ اس لیے اب وہ خود گاؤں میں خاندان کا سربراہ تھا۔ سرکاری ٹیوب ویل لگنے کی وجہ سے سیم بڑی حد تک ختم ہو چکی تھی البتہ کلراٹھی زمین خاصی جان توڑ محنت کے بعد فصل دینے کے قابل ہوئی تھی۔ وہ صبح سویرے مربعہ پر چلا جاتا۔ چھوٹے بھائیوں' بیٹوں اور بھتیجوں سے خوب محنت کراتا۔ آہستہ آہستہ زمین آباد ہونے لگی۔ وہیں مویشیوں کے لیے کچی حویلی بنالی۔ خود رات کو وہاں کبھی کبھار ہی جاتا' وہ بھی کسی ضرورت سے۔ اور سچ پوچھو تو اسے کوئی رہنے بھی نہیں دیتا تھا۔ رات پڑتے ہی گاؤں میں اس کی ڈھنڈھیا مچ جاتی تھی۔ جہاں چار آدمی اکھٹے ہوئے اور سوال اٹھا کہ شریفا کہاں ہے؟ گھر پر نہ ہوتا تو حویلی پر آدمی بھیج کر بلوایا جاتا۔ خود میں نے شروع شروع میں کئی بار اسے بلوایا۔ پھر وہ جمعرات کی شام التزاماً خود ہی گاؤں آجاتا تھا۔ یہی چند سال تھے جب مجھے شریفے کو قریب سے دیکھنے اور اس کی

باتوں سے لطف اٹھانے کا موقع ملا۔

اس کی زندگی کے بنیادی اصول محنت‘ دیانت‘ صداقت اور خود داری تھے۔ محنت کو اس نے کبھی عار نہ سمجھا۔ اس معاملے میں حدیث ”الکاسب حبیب اللہ“ کا اطلاق اس پر بخوبی ہوتا تھا۔ صداقت کے تمام پہلو یعنی دیانت داری‘ عدل اور صاف گوئی اس کی شخصیت میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ سچائی پر اس کا اعتقاد کس حد تک تھا‘ اس کا اندازہ کرنے کے لیے ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کرتا ہوں۔

شریفے کے چھوٹے بھائی بشیرے کی ایک کمزوری یہ تھی کہ محفل میں اگر کسی نے کوئی مبالغہ آمیز بات کی تو وہ پیچھے رہنے کو اپنی توہین سمجھتا اور فوراً اپنا کوئی واقعہ گھڑ کر سنا دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس مجلس میں شریفا موجود ہوتا بشیرے کی وہاں دال نہیں گلتی تھی۔ ایک دن محفل گرم تھی۔ شریفا ابھی نہیں آیا تھا۔ کسی شخص نے ایک اخباری بات بیان کی جس میں کوئی بچہ تیسری منزل سے گرا اور اسے خراش تک نہیں آئی۔ بشیرا خاموش کیسے رہ سکتا تھا۔ فوراً بولا ”لو یہ کیا بڑی بات ہے۔ ایک بار میں داؤد ہرکولیس فیکٹری کے بڑے ٹاور سے گر پڑا تھا اور میرا بال بھی بیکا نہ ہوا۔“ محفل پر سناٹا چھا گیا۔ ابھی سکوت طاری تھا کہ اتفاق سے شریفا بھی آ پہنچا۔ ایک قدر ناشناس نے اس سے پوچھا ”شریفے! تمھیں معلوم ہے‘ ایک بار بشیرا داؤد ہرکولیس فیکٹری کے بڑے ٹاور سے گر پڑا تھا اور اسے مطلق چوٹ نہیں آئی تھی؟“ شریفے نے بڑی سنجیدگی سے کہا ”ہاں بھئی‘ یہ روئی کا گالا جو ٹھہرا۔“ پھر تیوری چڑھا کر بھائی سے مخاطب ہوا ”بشیرے! تجھے کتنی بار سمجھایا ہے کہ پھینک نہ لگایا کر۔ کمبخت تیرے جھوٹ نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ غضب خدا کا لوگوں کی تمام زمینیں آباد ہو گئی ہیں اور ہماری زمین ٹھیک ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ تیرا جھوٹ ہماری ساری محنت پر پانی پھیر دیتا ہے۔“

سچائی کا ایک روپ صاف گوئی ہے جس میں شریفے کا جواب نہ تھا۔ اس

معاملے میں وہ ''خطائے بزرگان گرفتن خطاست'' کا بالکل قائل نہ تھا۔اگر اتفاق سے اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہوتا اور تحقیق کے میدان میں نکل جاتا تو ہمارے تحقیقی سرمائے میں یقیناً قابل قدر اضافہ کرتا۔اس کا کہنا تھا کہ ہمارے معاشرے کی اکثر خرابیوں کا سبب یہ ہے کہ ہم پیٹھ پیچھے بڑبڑ کرتے رہتے ہیں لیکن منہ پر بات کرنے کی ہمت نہیں کرتے اور ذاتی اغراض ومفادات یا خوف کے پیش نظر حق گوئی سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ یہ اس کا محض قول ہی نہ تھا' روزمرہ زندگی میں بھی وہ ''حق نشاید گفتن الا آشکار'' پرسختی سے عمل پیرا ہوتا تھا۔اسی وجہ سے علاقے کے چودھری اکثر اس کے طعن وتشنیع کا نشانہ بنتے رہتے تھے۔ یہ لوگ پیٹھ پیچھے اسے منہ پھٹ' پھٹا ڈھول' بدلحاظ' بدتمیز اور نجانے کیا کیا کہتے لیکن اس کے سامنے سب کو چپکی لگ جاتی تھی۔محفل میں جب وہ چہک رہا ہوتا تو سب لطف اندوز ہوتے البتہ ''چودھری'' قسم کے لوگ پہلو بدلنے سے بھی گریز کرتے کہ کہیں روئے سخن ان کی طرف نہ ہوجائے۔ایک شام محفل جمی ہوئی تھی۔گاؤں کے سب سے متمول اور پرہیزگار بزرگ' حاجی صاحب بھی بیٹھے تھے۔شریفا کسی سماجی موضوع پر بات کررہا تھا۔حاجی صاحب نے ایک مرحلے پر اختلاف کیا۔ شریفا بولا ''چاچا! نئی نسل پرانی نسل ہی سے سب کچھ سیکھتی ہے' ماں کے پیٹ سے سیکھ کر نہیں آتی۔اگر آپ کا سا دانا پردانا آدمی کسی کی بہن بیٹی پر ہاتھ ڈال دے تو دوسروں کو کیا کہا جاسکتا ہے۔'' حاجی صاحب کا منہ فق ہوگیا۔بڑی لجاحت سے بولے ''ارے یارو اسے روکو' یہ کس طرف چل پڑا۔'' شریفے نے فوراً موضوع بدل دیا۔بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔اگلی صبح میں نے ایک عمر رسیدہ شخص سے' جو رات کی مجلس میں حاضر تھا' اس بارے میں پوچھا۔اس نے ایک پرانے واقعے پر روشنی ڈالی۔ ''در ایام جوانی چنانکہ اُفتد دانی'' والا معاملہ تھا۔

نو دولتے چودھری' شریفے کا خاص نشانہ ہوتے تھے' بالخصوص اگر وہ کنجوس بھی

ہوں۔اس کا کہنا تھا کہ اگر خاندانی آدمی پر مفلسی بھی آ جائے تو سات پشت تک اس کی سیر چشمی نہیں جاتی اور نو دولتے کی سات پشت تک بھوک نہیں مٹتی۔غربت و غیرت کا جو امتزاج شریفے میں تھا۔اس دور میں عنقا کا حکم رکھتا ہے۔میں اس کی دل سے قدر کرتا تھا۔وہ گھر سے کھانا کھا کر آتا تھا۔ہم عشاء کے وقت کھاتے۔وہ پاس بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہتا۔باوجود اس تعلقِ خاطر اور ہر بار شدید اصرار کے وہ کبھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوا۔ایک دو لقمے تو بڑی بات ہے کبھی دسترخوان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔

جن دنوں شریفے کی حالت بہت پتلی تھی ایک دن حلقے کی زکوۃ کمیٹی کے چیئرمین نے اس کو چپکے سے بلوایا اور کہا ''شریفے! مجھے تمھارے حالات کا پتہ ہے۔اگر کہو تو میں تمھارا نام اپنے رجسٹر میں درج کر لیتا ہوں۔اس طرح تمھیں مستقل طور پر زکوۃ ملتی رہے گی۔''شریفے کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔تیور بدل کر بولا ''میں تمھیں زکوۃ کا مستحق نظر آتا ہوں؟ زکوۃ لُولے لنگڑوں اپاہجوں کا حق ہے۔دیکھو میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ہٹا کٹا ہوں۔محنت مزدوری کر سکتا ہوں۔میری زمین بھی ہے۔تم نے مجھے سمجھا کیا ہے؟ تمھیں مجھ سے یہ بات کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟............''اور بہت کچھ۔بے چارے چیئرمین کو جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔

شریفے کی میرے دل میں جو قدر و منزلت تھی اس کے زیرِ اثر میرا جی بہت چاہتا تھا کہ میں اسے کوئی تحفہ دوں لیکن میں ڈرتا تھا کہ وہ اسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دے گا اور مجھے اس سے دکھ ہوگا۔میں نے تصور میں کئی بار دیکھا کہ میں اسے کوئی چیز پیش کر رہا ہوں اور وہ نہایت سرد مہری سے کہہ رہا ہے ''چودھری! تحفہ برابر کی حیثیت والوں کو دیا جاتا ہے۔میں کسی ایسے شخص سے کوئی تحفہ قبول نہیں کر سکتا جسے میں خود کچھ نہ دے سکوں، خواہ وہ تم ہی کیوں نہ ہو۔''اب میں اسے کیسے بتاتا کہ میں نے اس سے کتنا

کچھ حاصل کیا تھا۔آخر شریفا جیت گیا۔میں اسے کچھ پیش کرنے کی جسارت نہ کر سکا۔دل کا ایسا غنی تھا کہ تنگدستی اس کے جذبۂ احسان کو مغلوب نہ کر پائی۔اپنی زمین پر سبزیاں بڑی نفاست سے کاشت کرتا۔کہنے کو تو یہ گھریلو استعمال کے لیے ہوتی تھیں لیکن وہ تو جیسے انھیں اپنی ملکیت ہی نہ سمجھتا تھا۔جس ضرورت مند کا جی چاہے توڑ لے۔ اپنے پرائے کی کوئی قید نہ تھی بلکہ راہ گیر تک متمتع ہوتے تھے۔اناج کی فصل کے موقع پر تو کسی سائل کے خالی ہاتھ جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔یہ جذبۂ احسان بعض اوقات ایثار کے درجے تک پہنچ جاتا تھا۔ایک شام اس کے گھر میں آٹا نہ تھا۔پڑوس سے سات سیر آٹا ادھار لایا۔ذرا دیر بعد نواحی آبادی کا ایک آدمی' جو شریفے کے جذبۂ ہمدردی سے واقف تھا' آ گیا اور اس سے امداد کی درخواست کی۔شریفا خاموشی سے اٹھا۔ترازو لایا اور ساڑھے تین سیر آٹا تول کر اس کو دے دیا۔تولنے کا مقصد عاریتاً دینا نہ تھا بلکہ آٹے کو برابر تقسیم کرنا تھا۔پھر کہنے لگا"فصل آنے میں ابھی دیر ہے۔کل میری حویلی پر آنا۔" دوسرے دن وہ آیا تو اپنی چند بھیڑوں میں سے ایک اسے دے دی کہ اسے بیچ کر گزارہ کرو۔مجھے یقین ہے کہ اگر وہ حاجت مند شریفے کی بجائے کسی متموّل آدمی کے پاس جاتا تو وہ اسے دو چار روپے دے کر ٹرخا دیتا۔

شریفے کی صرف ایک کمزوری تھی اور وہ تھی گوشت خوری۔موقع ملنے پر دو تین سیر گوشت آرام سے چٹ کر جاتا تھا۔اس میں چھوٹے یا بڑے گوشت کی قید نہ تھی۔کلیجی' اوجڑی' سری پائے' اس کی دستبرد سے کوئی چیز نہ بچتی تھی۔عید' بقرعید یا شادیوں وغیرہ کی تقاریب میں اسے جی بھر کر گوشت کھانے کا موقع ملتا تھا۔البتہ عام دنوں میں یہ شوق پورا کرنے کے لیے اس کو خاصے پاپڑ بیلنا پڑتے تھے۔لوگوں سے نصفا نصفی پر جانور لے لیتا اور اس انتظار میں رہتا کہ ان میں سے کوئی چارہ کھانے میں بے رغبتی دکھائے۔جونہی ایسا ہوتا' وہ پہلے اسے ذبح کرتا' پھر اس کے مالک کو بلا کر کہتا"لو بھائی سنبھالو اسے اور میرا

حصہ مجھے دے دو۔ بیمار ہو گیا تھا۔'' اسی تقریب سے ڈھور ڈنگروں کا علاج بھی کیا کرتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ شریفے کے علاج سے اسی خوش نصیب جانور کے جانبر ہونے کی امید ہو سکتی تھی جس کا مالک 'ملک الموت اور مسیحا دونوں کی طرف سے چوکنا رہتا۔ اس ضمن میں بڑے بڑے لطیفے مشہور تھے۔ مثلاً یہ کہ ایک بار شریفے کو دو تین ہفتے سے گوشت میسر نہیں آیا تھا۔ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ ایک دن صبح صبح عبدالغنی بادشاہ کی بیوی احمداں بھاگی بھاگی شریفے کے پاس آئی ''بھائی شریفے! ذرا جلدی سے آ کر دیکھنا۔ ہمارے بچھڑے کو کیا ہو گیا ہے۔'' شریفے نے صرف اتنا سوال کیا ''کتنا بڑا ہے؟''

''دو ڈھائی برس کا ہے۔ رات گئے تک بالکل تندرست تھا۔ خدا جانے کیا ہو گیا؟'' احمداں نے جواب دیا۔ ''اچھا تو چل' میں ابھی آیا۔'' احمداں نے پیٹھ پھیری اور شریفا چھری انٹی میں اڑس اس کے پیچھے لپکا۔ بچھڑے پر نظر ڈالتے ہی بولا ''اوہو یہ تو بڑی گڑ بڑ ہو گئی۔ جلدی سے ایک مٹھی نمک کوٹ کر لاؤ۔'' ادھر احمداں اوٹ میں ہوئی ادھر شریفے نے بچھڑے کو گرا' چھری پھیر دی۔

''ہائے شریفے یہ تو نے کیا کیا؟''

''دیوانی کہیں کی۔ تیرے ہٹتے ہی وہ گر گیا تھا۔ میں نے سوچا حرام کیوں جائے۔ چھری نہ پھیرتا تو کیا کرتا۔ یہ تو وہی مثل ہوئی نیکی برباد گناہ لازم۔''

حصولِ گوشت کے لیے انھی سرگرمیوں کے باعث 'شریفے کی چھری اور زبان کے ستائے ہوئے لوگ اسے بوچڑ کے لقب سے یاد کرتے تھے مگر یہ نشہ اس ترشی سے اترنے والا نہ تھا۔

شریفے کی بے پناہ مقبولیت کا سب سے بڑا سبب اس کی خوش مزاجی اور ظرافت تھی۔ روتوں کو ہنسانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ چھوٹی سی بات کو افسانہ نگاروں والی جزئیات کے ساتھ پیش کرتا اور اس کے مضحک پہلوؤں پر خصوصی توجہ دیتا۔

حاضر جوابی، فقرے بازی، پھبتی اور جگت کا استاد۔ عملی مذاق میں مہارت کا یہ عالم کہ موقع آنے پر لمحوں میں جامع منصوبہ تیار کر لیتا۔ اس کی شخصیت کے اس پہلو کے ساتھ، سچ تو یہ ہے کہ ایک مضمون میں انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا میں آپ کو صرف چند جھلکیاں دکھانے پر اکتفا کروں گا۔

شریفے کا گھر مسجد کے برابر تھا۔ مسجد کی دوسری جانب گلی۔ پھر محمد حسین ٹھیکیدار کا مکان۔ پھر ایک مکان اور گلی بیچ ایک وسیع احاطہ جس کا تعلق میرے مہربانوں سے ہے اور میں ہمیشہ یہیں فروکش ہوتا ہوں۔ دراصل میری زرعی اراضی دوسرے گاؤں میں شامل ہونے کے باوجود اس گاؤں سے قریب آلگتی ہے۔ شریفا شام کا کھانا کھا کر گھر سے نکلتا۔ چند منٹ ٹھیکیدار کے ہاں ٹھیکی لیتا، جیسے راگ سے پہلے اس کا الاپ ہوتا ہے۔ اس طرح ٹھیکیدار کے ہاں وہ ہنسی مذاق کا موڈ بنا لیتا اور آگے چل دیتا۔ وہ معمولی سے معمولی اور سنجیدہ سے سنجیدہ بات میں مزاح کا پہلو ڈھونڈ لیتا اور اس کا فوری اظہار بڑی بے ساختگی سے کر ڈالتا۔ ٹھیکیدار نے کچھ عرصہ قبل اپنی ساہیوال والی زمین کا تبادلہ کر کے چک نمبر ۱۹ میں زمین حاصل کی تھی۔ نیا پڑوس اچھا نہ تھا۔ فصل بھی چوری ہو جاتی اور جانوروں کی بھی خصوصی حفاظت کرنی پڑتی۔ ٹھیکیدار کا کسی زمانے میں محکمۂ نہر میں طوطی بولتا تھا مگر اب وہ ضعیف ہو چکا تھا۔ تین لڑکوں میں سے نہ تو کسی نے ٹھیکیداری سنبھالی اور نہ ہی زمینداری میں دلچسپی لی۔ ایک تو ناز و نعم میں پلے دوسرے سکولوں کالجوں میں وقت ضائع کیا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ اتفاق سے دو چھوٹے بھائیوں کے قد بھی بہت چھوٹے تھے، اس لیے شریفا اکثر انہیں مذاق کا نشانہ بنائے رکھتا تھا۔

ایک دن شریفا حسب معمول گھر سے نکل کر ٹھیکیدار کی طرف آیا۔ ٹھیکیدار پریشانی کے عالم میں سوچ میں غرق بیٹھا تھا۔ شریفے نے پوچھا ''ماموں کیا بات ہے چپ چپ بیٹھے ہو'' ٹھیکیدار نے آہ بھر کر کہا ''شریفے سوچتا ہوں کہ میں نے زمین کا

تبادلہ کر کے غلطی کی۔" شریفا بولا" ماموں میری بات مانو۔تم یہ زمین فروخت کر دو۔"

"لیکن فروخت کر کے کیا کروں ۔کوئی دوسری ٹھکانے کی زمین فوری طور پر کہاں ملے گی؟"

شریفے نے کمال متانت سے مشورہ دیا" ماموں تم زمین بیچ کر موت کا کنواں بنا لو۔" ٹھیکیدار نے بے نقط سنانی شروع کیں۔شریفا اپنا مشورہ جاری رکھتے ہوئے بولا "قسم خدا کی تمھارے یہ ٹیڈی بکرے موت کے کنویں میں موٹر سائیکل خوب دوڑائیں گے۔" گالیوں کی رفتار تیز ہوئی تو شریفا اٹھ کھڑا ہوا۔دروازے میں پہنچ کر رکا" اور تم ٹکٹ بیچا کرنا" کہہ کر دروازے کی اوٹ میں ہوگیا۔ذرا دیر بعد گالیوں کا طوفان تھما تو شریفے نے دروازے کے پیچھے سے سر نکال کر کہا" اللہ کی قسم اتنی آمدنی ہوگی کہ ٹھیکیداری اور زمینداری سب بھول جاؤ گے۔" اور گالیوں کی بوچھاڑ دوبارہ شروع ہونے سے پہلے ہی شریفا چوک پار کر چکا تھا۔

میں چودھری کہلوانا پسند نہیں کرتا ۔شریفا واحد آدمی تھا جو مجھے چودھری کہہ کر بلاتا تھا۔اس کے منہ سے یہ لفظ مجھے کبھی برا معلوم نہ ہوا۔اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ کسی مرعوبیت سے نہیں بلکہ دلی محبت سے مجھے اس طرح مخاطب کرتا تھا ورنہ سچ مچ کے چودھریوں کو تو وہ ساری زندگی خاطر میں نہیں لایا۔ایک دن میں نے پوچھا" شریفے کبھی تم نے چوری بھی کی؟" کہنے لگا" چودھری خدا کا بڑا شکر ہے، کبھی نہیں کی۔ہاں لڑکپن میں ہم عمروں کے ساتھ مل کر امرود، گنے، خربوزے وغیرہ توڑ لاتے تھے۔اس میں چوری سے زیادہ مہم جوئی کا دخل ہوتا تھا" میں نے کہا" اُن دنوں کا کوئی دلچسپ واقعہ یاد ہے؟" ذرا سوچ کر بولا" یہ پاکستان بننے سے کوئی چھ سات برس پہلے کی بات ہے۔میں چودہ پندرہ سال کا تھا۔ساتھ والے گاؤں میں ایک باہمن تھا۔لمبا چوڑا لحیم شحیم۔رات کے وقت اسے نظر کم آتا تھا۔اس نے خربوزوں اور تربوز کی باڑی لگائی ۔جب فصل تیار ہوئی تو رات

بھر تلوار لے کر رکھوالی کرتا۔لڑکے تلوار کے ڈر سے اس کی باڑی کا رخ نہیں کرتے تھے۔ایک چاندنی رات کو‘جب ہلکا ہلکا بادل چھایا ہوا تھا‘میں دو چار لڑکے ساتھ لے کر اس کی باڑی میں جا گھسا۔وہ خوابِ خرگوش میں مست خراٹے لے رہا تھا۔ہم نے بہت سے خربوزے توڑ کر ایک چادر میں باندھ لیے۔ایک لڑکے کو جو ہم میں سے بڑا تھا یہ پوٹ اٹھوا دی۔میں باہمن کے سرہانے کھڑا ہو گیا تا کہ دوسرے ساتھی دور نکل جائیں۔اچانک ایک بادل کی اوٹ سے چاند جھانکنے لگا۔میں نے سوئے ہوئے باہمن پر نظر ڈالی تو چاندنی میں اس کی چندیا چمکتی نظر آئی۔مجھ سے نہ رہا گیا۔ایک تربوز توڑ کر اس کے سر پر دے مارا۔وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور تلوار پکڑ کر میرے پیچھے بھاگا۔کمبخت اتنا بھاری بھرکم ہونے کے باوجود بڑا تیز دوڑتا تھا۔مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اسے پتہ نہ چل جائے کہ لڑکے کون سے گاؤں کے تھے۔ورنہ بات بزرگوں تک پہنچ جاتی۔بھاگتے بھاگتے ایک کھال آ گیا‘اس میں تھوڑا سا پانی تھا‘میں پھرتی سے اس میں اوندھے منہ لیٹ گیا۔پلک جھپکتے میں وہ بھی آ پہنچا مگر مجھے دیکھ نہ پایا۔کھال پار کرنے کی غرض سے اس نے میری کمر پر پاؤں رکھا۔میں سمجھا کہ اب یہ تلوار مار کر میرے دو ٹکڑے کرتا ہے۔لہٰذا میں پوری طاقت سے اچھلا۔وہ منہ کے بل گرا اور میں ایک لمبا چکر کاٹ کر اپنے گاؤں آ گیا۔“

ایک مرتبہ گاؤں میں منہ کھر کی بیماری کا زور تھا۔جانور کثرت سے مر رہے تھے۔کھالیں خریدنے والوں کی چاندی تھی۔انھی دنوں ایک نشست میں یہی موضوع زیر بحث تھا۔شریفا کہنے لگا ”یہ لوگ انسانی شکل میں گدھ ہوتے ہیں۔گورکنوں کی طرح ان کا پیشہ ہی ایسا ہے۔پرار سال کی بات ہے‘میں نے نصفا نصفی پر بھیڑیں لی تھیں۔صبح صبح ادھر میں باڑے سے بھیڑیں نکالتا اُدھر ایک کھالیں لینے والا گھوڑی پر سوار‘دونوں ٹانگیں ایک طرف لٹکائے‘آ دھمکتا اور بڑے چاؤ سے پوچھتا ”سناؤ بھئی ہے کوئی سودا؟“ مجھے غصہ تو بہت آتا مگر اس کا بھی روزی کا معاملہ تھا۔میں نے سوچا اس منحوس سے کسی

طرح پیچھا چھڑانا چاہیے۔ لال دین سندھو مرحوم کو تو تم جانتے ہو گے۔ بڑے میاں سوکھے چمرخ تھے مگر خلافِ طبع بات پر غصے میں بھوت بن جاتے تھے۔ ایک صبح میں نے بھیڑیں ہانکیں تو بابا لال اپنے گھر کے باہر والے دروازے میں پاؤں پسارے دھوپ سینک رہا تھا۔ ادھر سے کھالوں کا رسیا بھی قضائے مبرم کی طرح میرے سر پر آ پہنچا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا ''بھئی آج تو تم بڑے وقت پر آئے۔ رات سندھوؤں کے دو کٹڑے مر گئے ہیں۔ وہ دیکھو بابا لال دہلیز میں بیٹھا کتوں سے ان کی حفاظت کر رہا ہے۔ بس پہنچ جاؤ''۔ خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ گھوڑے کو ایڑ لگا کر بابے کے پاس جا کھڑا ہوا اور نیچے اترے بغیر پوچھا ''بابا جی کدھر ہیں کٹڑے؟''

''کیسے کٹڑے بے؟''

''وہی جو رات کو مرے ہیں۔''

''تیری ایسی تیسی۔ مریں تیرے گھر والے۔ تیری-----''

گالیوں کے ساتھ ہی بڑے میاں اٹھ کھڑے ہوئے۔ گھوڑا موڑتے موڑتے بابے لال کا پہلا لٹھ اس کی کمر میں پڑا اور دوسرا گھوڑے کے پٹھے پر۔ گھوڑا بگٹٹ بھاگا۔ جب گاؤں سے نکلتا نظر آیا تو میں نے آواز لگائی ''شیخ جی کھالیں گاؤں سے ذرا دور جا کر اتارنا' بستی میں بو نہ پھیلے'' وہ دن اور آج کا دن' وہ پلٹ کر ہمارے گاؤں نہیں آیا۔

بابا اللہ رکھا گاؤں میں سب سے معمر تھا۔ بھویں تک سفید ہو چکی تھیں۔ اس کے سرخ سفید چہرے پر لمبی سفید ڈاڑھی بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی بیوی کو مرے چند ہی روز ہوئے تھے اور ابھی صف ماتم بھی لپیٹی نہیں گئی تھی کہ نزدیکی گاؤں سے دو تین لڑکے ہمارے چک میں آئے۔ ان کا کبوتر مر گیا تھا اور انہیں کبوتری کا جوڑا بنانے کے لیے کبوتر کی تلاش تھی۔ اتفاق سے گاؤں میں داخل ہوتے ہی انہیں شریفا گھر سے نکلتا نظر آیا۔ لڑکے اسے پہچانتے تھے۔ بولے ''چاچا شریفے! تمھارے گاؤں میں کوئی سفید

کبوتر مل جائے گا؟ ہمارا کبوتر مر گیا ہے اور کبوتری بالکل سفید ہے" شریفے کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔ کہنے لگا" واہ بھئی واہ بڑے موقع پر آئے ہو۔ ہمارے ہاں بابے اللہ رکھے کی کبوتری بھی چند دن پہلے مری ہے۔ کبوتر ہے بھی بالکل سفید۔ مگر بابا اسے بہت عزیز رکھتا ہے۔ ذرا منت کرنی پڑے گی۔ وہ دیکھو سامنے صف پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں تمھارے ساتھ چلتا' مگر مجھے کام ہے۔ مربعے جا رہا ہوں۔" لڑکے خوشی خوشی بابے کے پاس پہنچے" بابا جی کبوتر دینا ہے؟"" کیسا کبوتر؟" بابے نے پوچھا۔" وہی جس کی کبوتری تھوڑے دن پہلے مری ہے" بابے کو شک گزرا۔ پوچھا کہ تمھیں کس نے بھیجا ہے؟ انہوں نے کہا" چاچے شریفے نے" بابا متحمل مزاج تھا اور شریفے کی عادت سے واقف بھی۔ اس نے بمشکل لڑکوں سے جان چھڑائی۔

بعض اوقات شریفے کا عملی مذاق خطرناک حدوں کو پہنچ جاتا تھا۔ ہمارے علاقے میں دستور ہے کہ بھیڑیں پالنے والے ایک گدھی ضرور رکھتے ہیں جسے رات کو بھیڑوں کے ساتھ باڑے میں بند کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر رات کے وقت باڑے میں کوئی بھیڑیا یا چور آ گھسے تو گدھی دانتوں اور لاتوں سے کام لینے کے علاوہ اتنا شور کرتی ہے کہ مالک کو خبر ہو جاتی ہے۔ اب اس علاقے سے بھیڑیوں کا تو خاتمہ ہو چکا ہے لیکن چوروں کی تعداد میں اتنا ہی اضافہ بھی ہو گیا ہے۔ ان دنوں گاؤں میں بھیڑوں کا ریوڑ صرف علی محمد کے ہاں تھا اور گاؤں کی اکلوتی گدھی بھی اسی کے پاس تھی۔ ایک قریبی گاؤں کے گدھے' جو ان دنوں شاید فارغ تھے' صبح سے شام تک ہمارے گاؤں کے کئی چکر لگاتے۔ شریفے کو غالباً اس کورٹ شپ کا علم تھا۔ اندھیری راتوں میں باری باری گاؤں کے دو آدمی ساری رات پہرہ دیتے تھے۔ ایک رات شریفے اور جیرے بروالے کی باری تھی۔ جب آدھی رات ڈھل گئی اور گاؤں والے نیند کے مزے لینے لگے تو جیرے نے کہا" شریفے شغل ہونا چاہیے ورنہ یہ پہاڑ سی رات کیسے کٹے گی؟" شریفے

نے جواب دیا ''اچھا کچھ کرتے ہیں۔'' ابھی شریفے کا زرخیز دماغ کوئی ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ دور سے گدھوں کے دوڑنے اور ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے کی آواز آئی۔ شریفا بولا ''لو کام بن گیا۔'' جیرے کے پلے کچھ نہ پڑا لیکن وہ بھی ایسے معاملات میں شریفے کے ذہن رسا کا قائل تھا لہٰذا خاموش رہا۔ یہ دونوں گاؤں کا ایک چکر لگا کر علی محمد کی ڈیوڑھی کے آگے پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آٹھ دس گدھے بڑے خشوع وخضوع سے سر جھکائے دروازے کے آگے کھڑے ہیں۔ شریفا جیرے کو خاموش رہنے کی تلقین کر کے آگے بڑھا۔ زور سے دروازہ کھٹکھٹا کر ہانک لگائی ''علی محمد دروازہ کھولو۔ شاہ بلاق (ضلع سیالکوٹ میں علی محمد کا نہالی گاؤں) سے مہمان آئے ہیں۔'' علی محمد تو پرلے کمرے میں سویا پڑا تھا۔ اس کی بوڑھی ماں پر ان الفاظ نے جادو کا اثر کیا۔ وہ خدا سے خیر مانگتی اٹھی اور علی محمد کو جگایا۔ بات بھی تشویش کی تھی۔ ان دنوں قریب ترین پختہ سڑک گاؤں سے سات میل دور تھی اور وہ بھی نہر کی پٹڑی کے راستے، جس پر محکمہ نہر والے کوئی سواری چلنے نہ دیتے تھے۔ بقول شخصے لوگ تو اس گاؤں میں رشتے ناتے کرنے سے بھی کتراتے تھے۔ بڑی بی کو فکر ہوئی کہ میرے میکے والوں پر کیا بپتا پڑی کہ سات میل چل کر رات ڈھلے پہنچے ہیں۔ خیر تو علی محمد آنکھیں ملتا ہوا آیا اور دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلنا تھا کہ طوفان سا آ گیا۔ گدھوں نے یلغار کر کے باڑے میں چھلانگیں لگا دیں۔ اب جو جنگ مغلوبہ شروع ہوئی تو کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اوپر سے گھپ اندھیرا۔ علی محمد کے اوسان ٹھکانے ہوئے تو اس نے لالٹین جلائی۔ اپنے بھائیوں کو جگایا اور سب نے مل کر کوئی گھنٹہ بھر کی محنت کے بعد ان بن بلائے مہمانوں کو گھر سے نکالا۔ اس خرگردی میں حملہ آور اور دفاع کرنے والے تو جانی و جسمانی نقصان سے بچ گئے لیکن ناکردہ گناہ بھیڑیں گھاٹے میں رہیں۔ جرمِ ضعیفی کی پاداش میں، دولتیوں اور لٹھوں کی ضربوں سے بعض کی ٹانگیں ٹوٹ گئیں اور کچھ چھوٹے میمنے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ لطف یہ ہے کہ

گھر والوں کو یہ معلوم نہ ہوسکا کہ دروازہ کھلوانے کے لیے آواز کس نے لگائی تھی۔کوئی اور ہوتا تو اس بات کو راز ہی رہنے دیتا لیکن شریفا تو وہی تھا جس نے لڑکپن میں خربوزوں کی کامیاب چوری کے بعد باہمن کے سر پر تربوز توڑ کر سوئے ہوئے فتنے کو بیدار کیا تھا۔لہٰذا دن نکلنے کے بعد جب علی محمد سے گلی میں اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو چھوٹتے ہی سوال کیا ''سناؤ علی محمد! رات ماموؤں کو پراٹھے پکا کر کھلائے یا نہیں؟'' علی محمد تڑپ اٹھا۔گالیاں دیتے ہوئے بولا ''اچھا تو یہ تمھاری حرکت تھی۔ بچو تمھیں پتہ ہے میرا کتنا نقصان ہوگیا۔میں یہ معاملہ پنچایت میں لے جاؤں گا۔'' شریفے نے گالیوں کا مع سود جواب دیتے ہوئے کہا ''ضرور لے جاؤ بلکہ آج ہی پنچایت بلاؤ۔آخر انھی ماموؤں کے بھانجے نکلے نا! ارے احمق رات گاؤں کی حفاظت کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔میں نے تمھارا امتحان لیا تھا۔مگر وہ کہتے ہیں نا کہ اونٹ بڈھا ہوگیا مُوتنا نہیں آیا۔بیٹا رات کے وقت دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھنا فرض ہوتا ہے کہ باہر کون ہے۔ایسے تو تم کسی دن گھر ہی لٹا بیٹھو گے۔چلو اب تمھیں سبق حاصل ہوگیا۔سستے چھوٹ گئے ہو۔خدا کا شکر ادا کرو اور میرا شکریہ بھی۔''

خدا جانے کیا بات تھی کہ کسی مقطع چقطع اور اپنے اوپر سنجیدگی طاری کیے رکھنے والے شخص سے شریفے کو خدا واسطے کا بَیر ہوتا تھا۔ایسے شخص کو دیکھتے ہی اس کی ہتھیلی میں کھجلی ہونے لگتی تھی۔دراصل خود اس کا ظاہر باطن ایک تھا۔ریاکاری کا اس سے بڑا دشمن شاید ہی کوئی ہو۔اس لیے بظاہر متقی اور عبادت گزار لیکن نیت میں فتور رکھنے والا آدمی اس سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔لیکن کبھی کبھی بھلے مانس اور نیک سیرت آدمی بھی اس کی اس عادت کا شکار ہوجاتے تھے۔ایک شام بابا روشن شریفے کے پاس آیا اور بولا ''شریفے! گاؤں کی مرغیوں میں بیماری پھیل رہی ہے۔میری چالیس پچاس مرغیاں ہیں۔میں چاہتا ہوں کہ وبا کی لپیٹ میں آنے سے پہلے انھیں فروخت کردوں۔یہاں تو

بیک وقت اتنی مرغیوں کا گاہک ملنے کا نہیں۔ میرے خیال میں مرغیاں لاہور لے جاؤں' پر مجھ سے تو اتنا وزن اٹھایا نہیں جاتا۔ تم آج کل نہر پر مزدوری کرر ہے ہو۔ میں تمھاری اجرت دے دوں گا۔ صبح میرے ساتھ لاہور چلو۔'' شریفا مان گیا۔ اُن دنوں مرغیوں کے فارم نہ ہونے کے برابر تھے اور بازار کی طلب دیسی مرغیوں ہی سے پوری ہوتی تھی۔

لاہور پہنچ کر بوڑھے راوی کے پل پر بس سے اترے۔ چھت سے مرغیوں کا ٹوکرا اتروا کر شریفے نے سر پر رکھا اور داتا دربار کی جانب چل دیے۔ انہیں ٹولنٹن مارکیٹ پہنچنا تھا۔ ٹکسالی دروازے کے قریب پہنچتے پہنچتے شریفے کو بابا روشن کی سفید ریش' سفید پوشی اور سب سے بڑھ کر اس کا باوقار طریقے سے آگے آگے چلنا کھلنے لگا۔ اس نے بابا روشن کو مشورہ دیتے ہوئے کہا ''اگر ہم بائیں ہاتھ ہو کر اس محلے سے گزر جائیں تو ٹولنٹن مارکیٹ جلدی پہنچ جائیں گے۔ ادھر اُمرا، کا محلّہ ہے۔ ممکن ہے مرغیاں اچھے داموں یہیں فروخت ہو جائیں۔ مارکیٹ میں کم پیسے ملیں گے'' روشن بولا ''مجھے تو راستوں کا پتہ نہیں' جیسے تمھاری مرضی'' دونوں اسی ترتیب سے آگے پیچھے ٹکسالی دروازے میں داخل ہو گئے۔ شریفے کو چوک نوگزے کی اقامت ترک کئے ایک آدھ برس ہی ہوا تھا۔ ذرا آگے پہنچے تو دائیں بائیں کھسر پھسر ہونے لگی۔ بابا شریفا آیا۔ بابا شریفا آیا! اس اظہار واقفیت سے شریفے کا منصوبہ خراب ہو سکتا تھا' لہٰذا اس نے بابا روشن کے پیچھے چلنے کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے انگلی سے اشارہ کیا کہ میری خیریت پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ ذرا اس بڈھے سے نمٹو۔ اشارہ پاتے ہی اِدھر اُدھر سے طوائفوں نے بابا روشن کا محاصرہ کر لیا۔ کوئی ادھر کھینچتی کوئی ادھر دھکا دیتی۔ ساتھ ساتھ گالیوں کا طوفان۔ تفصیلات کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ بابا روشن کے لیے یہ مضمون نیا تھا۔ بہتیرے ہاتھ پاؤں چلائے مگر وہاں کیا پیش جاتی۔ آخر دس پندرہ منٹ کی تھکا فضیحتی اور کھینچا تانی کے بعد کماندار کی طرف سے پسپائی کا سگنل ملا۔ مقصد حاصل ہو چکا تھا۔ فرار کا راستہ پا کر بابے

نے لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کیے۔ وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ بس چلتا تو شریفے کو کچا ہی چبا جاتا۔ ذرا آگے نکل کر شریفے نے ایک اور وار کیا "بابا ہم تو راہگیر تھے۔ بھلا تم نے انہیں چھیڑا کیوں تھا؟ خواہ مخواہ بے عزتی کرائی۔ ان سے کون پورا اتر سکتا ہے" بابا پھٹ پڑا "حرامزادے! یہ سب تیری شرارت ہے ورنہ یہ تیری بہن بھانجیاں اس طرح مجھ پر پل نہ پڑتیں۔ اچھا ذرا گاؤں پہنچ لوں، پھر تجھ سے سمجھوں گا۔"

"لو بھلا میری شرارت کیسے ہوسکتی ہے۔ میرے سر پر تو ڈیڑھ دومن بوجھ تھا۔ دونوں ہاتھوں سے میں نے اسے تھام رکھا تھا۔ تم ہی آگے آگے ہنس کی چال چل رہے تھے۔ ہاتھ بھی تمھارے خالی تھے۔ دست درازی بھی تم ہی کر سکتے تھے۔ کوئی معقول آدمی مجھے قصوروار نہیں ٹھہرائے گا" شریفے نے حسب معمول دلیل کے ساتھ بات کی۔

"اور تم نے یہ راستہ اختیار کیوں کیا تھا؟"

"میں تو تمھارے بھلے کے لیے آیا تھا۔ اگر تم چھیڑ خانی نہ کرتے تو میں کھڑے کھڑے تمھاری مرغیاں اچھے بھاؤ بکوا دیتا۔" بابا روشن نے خاموشی ہی میں عافیت سمجھی۔ اس نے سوچا یہ مجھے کسی اور مصیبت میں نہ پھنسا دے۔ یہاں اس کی واقفیت بہت ہے۔ میں اجنبی ہوں۔ لیکن گاؤں چل کر نمٹنے کی دھمکی دے کر وہ شریفے کی جولانیوں کو ایک اضافی میدان فراہم کر چکا تھا۔ جوں توں کر کے مارکیٹ پہنچے۔ اونے پونے مرغیاں فروخت کیں۔ روشن کو کچھ سودا سلف بھی لینا تھا۔ شریفا بولا "لاؤ میری مزدوری۔ میں تو واپس جاؤں۔ تم شہر میں پھرنے کے لائق ہی نہیں ہو۔ کوئی اور ٹنٹا کھڑا کر دو گے۔" شریفا سیدھا گاؤں پہنچا۔ سب سے پہلے گاؤں کی باوقار اور بزرگ نمبردارنی حاکم بی بی نظر آئی "ماسی حاکے! تم بھی کہا کرتی ہو کہ روشن بڑا نیک اور شریف آدمی ہے۔ اس کی تازہ حرکت سنو۔۔۔" اور شریفے نے روشن کی "زیادتی" اور اپنی "مظلومیت" کی داستان خوب نمک مرچ لگا کر سنائی۔ مائی حاکے توبہ توبہ کرتی رخصت ہوئی۔ شریفے نے گاؤں میں دو چار جگہ

یہ واقعہ اپنے انداز میں سنا کر ہی گھر میں قدم رکھا۔

ایک بار میں نے بابا روشن سے اس بارے میں دریافت کیا تو اس نے شریفے کو گالیاں دیتے ہوئے بتایا''میں نے اسے مزدوری دینے کے بعد منت بھی کی تھی کہ گاؤں جا کر یہ قصہ کسی کو نہ بتانا مگر یہ بڑا بدذات ہے۔ جب میں مغرب کے وقت گاؤں پہنچا تو یہ واقعہ بچے بچے کی زبان پر تھا۔ بس جی' میں تو کہتا ہوں کہ کوئی حلال کا تخم اس خبیث کے ساتھ شہر نہ جائے۔''

شریفے کی موت سے کوئی آٹھ نو ماہ قبل ایک افسوس ناک واقعہ رونما ہوا جس کے سبب اس کو ہماری محفلوں میں شمولیت ترک کرنا پڑی۔ ہوا یوں کہ جس خاندان سے میری مواخاۃ تھی ان کے چچا کا ایک داماد ضلع سیالکوٹ میں رہتا تھا۔ جوان اولاد تھی مگر دوسری شادی کا بھوت سر پر سوار ہو گیا۔ بیوی بچے ناراض ہو کر اپنے ننہال میں آ کر بیٹھ رہے۔ یہاں بھی ان کی کچھ زمین تھی۔ داماد نے اس زمین کو فروخت کرنا چاہا۔ سسرال والے مزاحم ہوئے۔ ایک دن وہ چپکے سے برابر والے گاؤں میں زمین کا سودا کرنے آ گیا۔ انھیں خبر ہوئی تو چھ سات نوجوان' جن میں اس کے اپنے لڑکے بھی تھے' بندوقیں کلہاڑیاں وغیرہ لے کر اس کے پیچھے گئے۔ مقصد محض ڈرانا دھمکانا تھا۔ نہر کے قریب آمنا سامنا ہو گیا۔ وہ انہیں دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ تعاقب کرنے لگے۔ اتفاق سے شریفے کی حویلی قریب تھی۔ عصر کا وقت ہو گا۔ شریفا حویلی کے باہر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اندر لڑکے چارا کتر رہے تھے۔ فرار ہونے والے نے شریفے سے پناہ طلب کی اور حویلی میں گھس گیا۔ شریفے نے اپنے بیٹوں کو للکارا۔ وہ آواز سنتے ہی باہر نکلے اور نہتے ہونے کے باوجود تعاقب کرنے والوں سے بھڑ گئے۔ بندوقین چھین لیں۔ طرفین کو زخم بھی آئے۔ معاملہ تھانے کچہری تک پہنچا۔

شریفا اب گاؤں بہت کم آتا۔ بیشتر راتیں بھی حویلی پر گزارتا۔ تین چار ماہ

سے میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اس کی کمی بہت محسوس ہوتی تھی۔ ایک جمعرات کی شام اندھیرا پڑے میں مسجد کے آگے سے گزر رہا تھا۔ شریفا گھر سے نکل کر حویلی کو جا رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا اور آہستہ سے آواز دی "چودھری!" میں اس کی آواز پہچان کر اس سے لپٹ گیا۔ چند لمحوں کے بعد جب ہم جدا ہوئے تو دھیمے لہجے میں کہنے لگا "چودھری! یہ ہمارے برادری کے معاملات ہیں۔ الجھتے سلجھتے رہیں گے۔ تو ان سے کوئی اثر نہ لینا۔ ہمارا تجھ سے خاص پیار ہے۔" میں نے کہا "شریفے جو کچھ تم نے کیا' یہی کرنا چاہیے تھا۔ جوانمردی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ اس واقعے سے میرے دل میں تمھاری قدر ومنزلت میں کمی نہیں' اضافہ ہو گیا ہے" وہ بہت عجلت میں معلوم ہوتا تھا۔ اللہ بیلی کہہ کر حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

چند ماہ اور گزر گئے۔ ایک دن میرے بچے گاؤں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھٹے کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ بھٹوں کا موسم گزر چکا تھا۔ کسی نے بتایا بھٹے صرف شریفے کے ہاں مل سکتے ہیں۔ میں نے موقع غنیمت جانا۔ تھوڑی دیر بعد چپکے سے بچوں کو ساتھ لے شریفے کی حویلی پر پہنچ گیا۔ گاؤں سے آدھ میل کا فاصلہ ہو گا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ وہ بدستور حویلی کے باہر زمین پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔ بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ لڑکوں کو آواز دی کہ چارپائی لاؤ۔ میں نے کہا "چارپائی کی ضرورت نہیں۔ میں یہیں تمھارے پاس زمین پر بیٹھوں گا۔ یہ بچے بھٹے کھانے کو کہہ رہے تھے۔ میں انھیں لے کر ادھر چلا آیا۔" اس نے لڑکوں کو بھٹے لانے کے لیے کہا۔ خود خشک ٹہنیاں رکھ کر آگ جلائی۔ لڑکے بھٹے لائے۔ دیکھ کر بولا "انہیں تو اچھے بھٹوں کی پہچان بھی نہیں۔ میں خود لاتا ہوں۔" ذرا دیر بعد جھولی بھر کر لایا۔ خوشی کے مارے اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ اپنے ہاتھوں سے بھون بھون کر ہمیں کھلاتا رہا۔ ان بھٹوں میں جو لذت تھی وہ دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت میں بھی نہ ہو گی۔ ہم ادھر ادھر کی

باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔میں نے دیکھا کہ حویلی کے آگے چھوٹے بڑے کتوں کی ایک غیر معمولی تعداد موجود تھی۔میں نے ہنستے ہوئے کہا "یہ تم نے کتوں کا فارم کب سے کھول لیا؟" وہ چلم میں آگ رکھتے ہوئے بولا "اردگرد کی بستیوں سے دھتکارے ہوئے خود ہی چلے آتے ہیں۔ پھر جانے کا نام نہیں لیتے۔اب میں انہیں مارنے سے تو رہا۔اللہ کی مخلوق ہے۔صبح شام روٹی کا ٹکڑا ٹکڑا ڈال دیتا ہوں۔ابھی پرسوں یہ چتکبری کُتیا آٹھ پلّے لے کر اس ٹھسّے سے آئی جیسے میکے آرہی ہو۔میں نے کہا بھی کہ تو یہ سارا خانوادہ لے کر کیوں چلی آئی مگر وہ میرے پاؤں پر لوٹنے لگی۔پڑے رہو۔میرا کیا لیتے ہیں۔" مجھے شریفا اس دور کا دیو جانس کلبی نظر آیا۔

وقت گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا۔سورج غروب ہونے لگا تو میں نے اجازت چاہی۔بولا "ہاں اندھیرا پڑ گیا تو بچوں کو کھیتوں کی مینڈوں پر چلنے میں تکلیف ہوگی۔کچھ فاصلہ بھی ہے۔چلو میں گاؤں تک تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" گاؤں کے قریب پہنچ کر وہ خاموشی سے جدا ہوگیا۔مجھے اس لمحے وہ کچھ بجھا بجھا سا نظر آیا۔بس یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔پھر ہم ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ پائے اور اس کی سناؤنی آگئی۔

شریفے کا جنازہ جب قبرستان کی طرف چلا تو اس کے پیچھے پیچھے ایک چتکبری کتیا بھی چل رہی تھی۔تدفین کے بعد سب واپس ہوگئے لیکن کتیا قبر پر سر رکھ کر بیٹھ گئی۔اگلے دن گھر والے قبر پر چھڑکاؤ کرنے آئے تو وہ اسی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔اسے پکڑ کر واپس لایا گیا۔روٹی ڈالی تو اس نے سونگھی تک نہیں اور پھر بھاگ کر قبرستان پہنچ گئی۔آخر تیسرے روز جب اس کا بھوک سے مرنے کا اندیشہ ہوا تو اسے لا کر زنجیر سے باندھ دیا گیا۔میں یہ فیصلہ شاید کبھی نہ کرسکوں کہ وہ کتیا شریفے کی زیادہ قدردان تھی یا میں؟

کالے خاں

۱۹۶۱ء کے موسمِ گرما کی تعطیلات تھیں اور مَیں لاڑکانہ میں مقیم تھا۔۱۹۵۶ء میں بنوائے ہوئے پاسپورٹ کے استعمال کی نوبت ہی نہ آئی تھی اور ال اس کی میعاد ختم ہونے میں چند ماہ رہ گئے تھے۔میں نے والدہ سے تذکرہ کیا کہ اگر وہ اجازت دیں تو میں کچھ دنوں کے لئے آبائی گاؤں کا چکر لگا آؤں۔اجازت ملنے پر میں نے ویزا حاصل کیا اور اگست کے اوائل میں کھوکھراپار کے راستے عازمِ جودھپور ہوگیا۔روانہ ہونے سے قبل والدہ نے کہا کہ تم اچانک جارہے ہو۔اگر سٹیشن پر اتر کر گاؤں جانے کے لئے کوئی سواری نہ ملے تو گاؤں جانے والے راستے پر قصبے کی آبادی ختم ہونے سے ذرا پہلے میرے ایک رشتے کے چچا کالو کاکا[1] کی بیٹی اور داماد رہتے ہیں۔داماد کا نام ابراہیم خاں ہے۔تم اس سے مل لینا۔وہ تمھیں گاؤں پہنچانے کا انتظام کردیں گے۔یاد رہے کہ سواری سے مراد صرف اونٹ تھا کیونکہ اُس وقت تک گاؤں کی سڑک نہیں بنی تھی اور ریت کے ٹیلوں میں بل کھاتا راستہ صحرائی جہازوں کے رن وے کی حیثیت رکھتا تھا۔

میں علی الصبح جودھپور پہنچا۔وہاں سے دوسری ٹرین پکڑی اور چند گھنٹے میں گاؤں سے نزدیک ترین سٹیشن پر اتر گیا۔باہر نکل کر ایک آدمی سے گاؤں کا راستہ پوچھا اور اپنا بیگ کندھے پر ڈال کر چل پڑا۔آبادی ختم ہونے کو آئی تو ایک دکاندار سے ابراہیم خاں کا مکان دریافت کیا۔ابھی اس نے کوئی جواب نہ دیا تھا کہ سودا لیتا ہوا ایک

شخص، جس کے سر پر مسلمانوں والی پگڑی تھی اور اس کا بیلوں کا چھکڑا دکان کے آگے کھڑا تھا، بول اٹھا: ''ابراہیم خاں کا مکان تو قریب ہی ہے لیکن وہ کہیں گیا ہوا ہے۔ آپ کو اس سے کیا کام ہے؟'' میں نے اپنا مسئلہ بتایا تو وہ کہنے لگا ''اونٹ تو اس وقت ملنے کا نہیں۔ اگر مناسب سمجھو تو میرے چھکڑے پر بیٹھ جاؤ۔ میں اسی طرف جا رہا ہوں۔'' مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ فاصلہ تو تین میل سے بھی کم ہی ہوگا لیکن ٹیلوں میں راہ سے بھٹکنے کا جو اندیشہ تھا وہ اس طرح دور ہو گیا۔ اور یہ بہت اچھا ہوا کیونکہ راستے میں بعض جگہوں پر ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی گذاریں[۲] ملیں۔ راہ میں اس شخص نے صرف ایک سوال کیا۔ ''کس کے ہاں جاؤ گے؟''

''حویلی میں'' میں نے مختصر جواب دیا۔ حویلی سنگ سرخ و زرد کا ایک مکان تھا جو میرے پردادا نے کبھی کبھار ٹونک سے گاؤں آنے پر قیام کی غرض سے تعمیر کرایا تھا۔ چھکڑے والے کو شاید اگلے گاؤں جانا تھا[۳] لہٰذا ایک میدان میں اس نے بیلوں کو روکا اور دائیں جانب اشارہ کر کے کہا: ''وہ سامنے حویلی ہے۔'' میں اس کا شکریہ ادا کر کے اتر گیا۔

حویلی کے دو روزہ قیام میں صبح سے شام تک ملنے والوں کے ٹھٹ لگے رہتے تھے بلکہ آدھی رات تک رونق رہتی تھی۔ تیسرے دن، حویلی کے قیام کی روایت پوری کر کے، مغربی سمت میں واقع آخری گاؤں پہنچا جہاں میرا ننہال تھا۔ مشایعت کرنے والے عزیز شام کو واپس لوٹ آئے۔ وہاں بھی رات گئے تک مجمع رہا۔ نانا جان مرحوم بستی کے متموّل ترین فرد تھے لیکن جُزرسی کے عادی۔ البتہ نانی جان، خدا غریق رحمت کرے، بڑی خوبیوں کی مالک تھیں۔ وہ دادا جان کے حقیقی چچا یعقوب خاں کی بیٹی تھیں۔
اگلی صبح میں اور نانا جان مکان کے آگے کھلی گواڑی[۲] میں بچھی چارپائیوں پر نیم دراز تھے۔ اچانک شمال مشرقی گوشے کے پھاٹک سے ایک صاحب اندر داخل

ہوئے اور زور سے السلام علیکم کہا۔ چارپائیوں تک پہنچتے پہنچتے میں نے ان کے سراپا کا جائزہ لیا۔ سانولا رنگ، گھنی سفید ڈاڑھی، سفید کھادی کی شلوار اور کرتا، سر پر سفید پگڑی، عمر ستر کے لگ بھگ ہوگی لیکن جسم چست اور پھرتیلا تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتے قریب آگئے۔ نانا جان نے دیکھتے ہی کہا ''آؤ بھئی کالے خاں! کیا حال ہیں؟ اتنے دن نظر نہیں آئے؟ میں اٹھ کر ملا۔ معانقہ و مصافحہ سے فارغ ہو کر نانا جان سے مخاطب ہوئے ''میں کلکتہ چلا گیا تھا۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے اپنی مصروفیت کا۔ دن تو زیادہ لگ گئے لیکن مسجد کی تکمیل کا سامان ہو گیا۔'' اتنے میں نانی جان ناشتہ لے آئیں۔ نو وارد کو سلام کیا اور ناشتے کی دعوت دی۔ وہ بولے ''ہاں ہاں، کیوں نہیں! ناشتہ تو ضرور کروں گا۔ تم بھی دل میں کہتی ہوگی کہ عین ناشتے کے وقت یہ مفت خورا کالو کہاں سے آگیا۔'' نانی ہنس پڑیں اور بولیں ''نہیں بھائی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم تو یوں بھی گاؤں میں مہمانوں کی طرح آتے ہو۔ جب دیکھو دورے پر نکلے ہوتے ہو۔''

ناشتہ شروع ہوا تو میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ کالے خاں بڑی تمیز کے ساتھ ناشتہ کر رہے تھے، گنواروں والی کوئی بات نہ تھی۔ چائے بھی اسی نفاست کے ساتھ پی۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ زیادہ تر مجھ ہی سے مخاطب رہے۔ بیچ بیچ میں نانا جان سے بھی چھیڑ چھاڑ کر لیتے تھے۔ زندہ دلی اور حاضر جوابی ان کی بات بات سے ٹپکتی تھی۔ ان کی رواں اور بامحاورہ اردو سے بھی مجھے اچنبھا ہوا کیونکہ وہاں ہوتا یہ تھا کہ ہم لوگ ہمیشہ اردو میں بات کرتے تھے اور مقامی اعزہ ٹھیٹھ مارواڑی میں۔ طرفین ایک دوسرے کی بات بخوبی سمجھ لیتے لیکن ایک دوسرے کی زبان بولتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی تھی۔ کالے خاں مجھ سے گفتگو میں صرف چند مقامی الفاظ استعمال کر لیتے تھے، وہ بھی ایسے جن کا صحیح نعم البدل اردو میں نظر نہیں آتا۔ مثلاً مجھے وہ لفظ ''بھانیاں'' (نون ثقیلہ اور یائے خفیفہ کے ساتھ) سے مخاطب کرتے اور جب والدہ کا

ذکر آتا تو ''بائی ؒ'' کے الفاظ سے یاد کرتے۔ان کی باتیں اتنی دلچسپ تھیں کہ توجہ ذرا بھی ادھر ادھر نہیں ہوتی تھی۔ پھر موضوعات میں وہ رنگارنگی کہ اکتاہٹ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ مسئلے مسائل' سفر کے حادثات' زندگی کے تجربات' انسانی نفسیات کی بوالعجیاں' حاضر جوابی کے واقعات' چٹکلے اور مقامی زبان کی نظمیں اور ضرب الامثال۔گفتگو کیا تھی ایک سیلِ رواں تھا جو ہر چیز کو خس وخاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ مجھے بے اختیار یہ اشعار یاد آ گئے:

اب سامنے میرے جو کوئی پیروجواں ہے ۔۔۔ دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
میں حضرتِ سودا کو سنا بولتے یارو! ۔۔۔ اللہ رے اللہ! کہ کیا زورِ بیاں ہے

اس اثنا میں مجھ سے ملنے کے لیے جو لوگ آتے وہ سلام دعا کے بعد خاموشی سے بیٹھ جاتے۔ کالے خاں ذرا سا وقفہ دے کر پھر تسلسل قائم رکھتے۔تین چار گھنٹے یہ سلسلہ جاری رہا اور وقت گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا۔جب دوپہر ہونے کو آئی تو کالے خاں یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ ''مجھے ظہر کے وقت فلاں گاؤں پہنچنا ہے جہاں مسجد تعمیر ہو رہی ہے۔انشاء اللہ کل صبح ملاقات ہوگی'' اور تیز تیز قدم اٹھاتے یہ جا وہ جا۔

کچھ دیر محفل پر خاموشی طاری رہی۔ پھر انھی کی باتیں ہونے لگیں۔معلوم ہوا کہ تن تنہا ہیں۔عرصہ ہوا بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ایک بیٹی ہے وہ بھی اپنے گھر کی۔ان کی اپنی ضروریات بڑی محدود ہیں۔کھانے پکانے کا جھنجھٹ بھی کم ہی پالتے ہیں۔ کھانے کے وقت جس کے گھر بیٹھے ہوں' وہیں جو کچھ ملا کھا لیا۔ویسے بھی ان کا بیشتر وقت دور دراز کے سفروں میں ہی گزرتا تھا۔سفر کی تقریب یہ تھی کہ انھوں نے اپنے آپ کو علاقے کے مسلمانوں کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔نئی مساجد کی تعمیر اور پرانی مساجد کی مرمت ان کا خاص میدان تھا۔مارواڑ کے علاقے میں ہمارے گاؤں جیسی خالصتاً مسلمان آبادیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔دو چار گھر مختلف دیہات میں ہوتے

تھے۔ان مختصر سی آبادیوں کے لیے جن کی مالی حالت بھی اچھی نہ ہوتی 'مسجد تعمیر کرنا دشوار تھا۔بعض دیہات میں مسلمان بادشاہوں کی بنائی ہوئی شاندار مساجد موجود تھیں لیکن ان کی مرمت بھی لوگوں کے بس کی بات نہ تھی۔ان لوگوں کے لیے کالے خاں خدائی خدمت گار بلکہ فرشتۂ رحمت تھے۔ان کا کام صرف اطلاع دینا تھا' پھر کالے خاں جانیں اوران کا کام۔اس کارِخیر کے لیے نقد عطیات اور تعمیراتی سامان فراہم کرنے کی غرض سے وہ بڑے بڑے شہروں مثلاً بمبئی' احمد آباد' دہلی' لکھنو' کانپور' کلکتہ اور مدراس کے متموّل مسلمانوں کا تعاون حاصل کرتے۔خوداعتمادی تو ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔اپنی متعدد خوبیوں بالخصوص بذلہ سنجی' حاضر جوابی اور صاف گوئی کی بنا پر وہ مسلمان امیروں اور سیٹھوں میں بڑے مقبول تھے۔جہاں جاتے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے۔ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کے لیے باقاعدہ دعوتوں اور محفلوں کا اہتمام کیا جاتا جن میں میزبان اپنے دوستوں کو مدعو کرتے۔ہر وقت ننانوے کے پھیر میں گرفتار سیٹھوں اور تاجروں کے لیے کالے خاں کی آمد بادِ بہاری کا جھونکا ہوتا تھا جو ان کے پژمردہ اعصاب پر آبِ حیات کی پھوہار بن کر گرتا۔ان مختصر وقفوں میں وہ لوگ غمِ روزگار کو فراموش کر کے زندگی سے لطف اندوز ہوتے۔

متموّل طبقے میں دونوں طرح کے لوگ ہوتے۔مخیّر بھی اور کنجوس بھی۔لیکن کالے خاں کی مہارت کا یہ حال تھا کہ وہ خسیس سے خسیس آدمی سے بھی کچھ لے کر ہی ٹلتے تھے۔اس کام کے لیے انھیں بہت سے گُر یاد تھے۔مثلاً بمبئی میں ایک صاحب کئی دن تک چندہ دینے سے بچتے رہے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ کالے خاں کو ان کی نادہندگی کا علم نہیں۔یہ بھی ڈھیل دیتے رہے۔جب واپسی کا دن آن لگا تو ایک صبح اس کے دفتر جا دھمکے۔ایسی شگفتہ باتیں کیں کہ وہ لوٹ پوٹ ہوگیا اور بے اختیار ہوکر بولا ''بھئی کالے خاں! آپ کی باتیں بڑی مزیدار ہوتی ہیں۔'' کالے خاں تو اسی موقع کی تلاش میں

تھے۔فوراً بولے"جی ہاں!باتیں تو مزیدار ہوتی ہیں لیکن وہ مسجد کا چندہ...؟" سیٹھ صاحب ٹھگ مارے سے ہو گئے۔ پہلو کھجاتے ہوئے کہنے لگے"ہاں----وہ----چندہ ---- بھئی کالے خاں ----بات یہ ہے کہ----آج تو میں چیک بک گھر بھول آیا ہوں اور آپ واپس جارہے ہیں----" کالے خاں نے گرم لوہے پر چوٹ لگائی"سیٹھ جی! یہ بات نہیں ہے۔اصل بات یہ ہے کہ ع: منہ کے بڑے دراز' دل کے چ...ں ہو۔" کالے خاں کا ترنم سے یہ مصرع پڑھنا کارگر ثابت ہوا اور سیٹھ صاحب کو ایک معقول رقم پیش کرتے ہی بنی۔

اگلے دن میں صبح ہی سے ان کا منتظر تھا۔وہ ذرا دن چڑھے آئے اور بیٹھتے ہی اسی اندازِ گل افشانیِ گفتار کا سلسلہ شروع ہوگیا۔کہنے لگے"تم جس موسم میں آئے ہو یہ صحرائے مارواڑ کا بہترین موسم ہوتا ہے یعنی برسات۔کہنے کو تو ہمارے ہاں ایک کہاوت ہے کہ:

ناگونو تے نت بھلوار ساون بیکانیر   سردالے کھاٹو بھلی اراونہالے اجمیر

(ناگور کا موسم تو ہمیشہ اچھا ہوتا ہے اور ساون بیکانیر کا قابلِ دید ہے۔موسمِ سرما کھاٹو کا بہتر ہے اور گرمیاں اجمیر کی) لیکن حقیقت یہ ہے کہ مارواڑ کی برسات کا جواب نہیں۔پانی کی ایک ایک بوند کو ترستی ہوئی زمین پہل چھلا پڑتے ہی چند پہروں میں سرسبز ہو جاتی ہے اور ان سبزہ زاروں میں ناچتے ہوئے مور عجب بہار دکھلاتے ہیں۔اسی لیے بڑے بڑے مارواڑی (ہندو) سیٹھ جو مدراس' کلکتہ اور بمبئی وغیرہ میں کاروبار کرتے ہیں' برسات کا آغاز ہوتے ہی دیوانہ وار موسمی پرندوں کی مانند' وطن کا رخ کر لیتے ہیں۔اسی لیے تمھارے دادا بھی گرمی کی تمام چھٹیاں یہاں گزارتے تھے۔تمھیں بھی چاہیے کہ اگر ہر سال نہیں تو دوسرے تیسرے سال چھٹیوں میں ضرور آجایا کرو۔"

دادا جان کا ذکرِ خیر ہمارے گاؤں کے لوگوں کا پسندیدہ موضوع ہے۔ان کے

اوصاف حمیدہ کا ذکر چھڑا تو بات عظمت انسانی تک پہنچ گئی۔ کالے خاں نے لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کی روشنی میں انسانی کمالات کی رنگا رنگی پر جو گفتگو شروع کی تو میں ان کا منہ تکتا رہ گیا کہ ایک نیم خواندہ اور مدرسہ نادیدہ شخص فلسفیانہ اور حکیمانہ نکات کس خوش اسلوبی سے بیان کر رہا ہے۔ اس بحث و تمحیص کی سب سے دلچسپ چیز ایک طویل مارواڑی نظم تھی جس کے چار چار مصرعوں پر مشتمل سترہ اٹھارہ بند کالے خاں نے اپنے دردناک مترنم انداز میں سنائے۔ ہر بند کے بعد ٹیپ کا مصرع: ''چرکھڑو بھلوای گھڑیورے'' دہرایا جاتا تھا جو اسی محولہ بالا آیت کا ترجمان تھا۔ انسان کو چرخے سے تشبیہ دینے کی روایت برعظیم کی مختلف زبانوں کی شاعری میں موجود ہے۔ اس ضمن میں پنجابی زبان میں بھی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً شاہ حسین کی یہ مشہور کافی: گھم چرخیا گھم۔

کالے خاں کی پیش کردہ نظم میں انسانی زندگی کے مختلف مراحل اور ان میں اس کی جولانیوں اور کامرانیوں کا بھرپور جائزہ لیا گیا تھا۔ میں یہ نظم سن کر مسحور سا ہو گیا۔ نظم ختم ہوئی تو کچھ دیر سناٹا رہا۔

دوسرے حاضرین کی طرح نانا جان بھی بڑی متانت سے کالے خاں کی باتیں سن رہے تھے۔ کالے خاں نے محفل کا رنگ بدلنے کے لیے ان کو چھیڑا: ''علاء الدین خاں! یہ آپ کا نواسہ برسوں کے بعد آیا ہے۔ اس کے اعزاز میں کوئی بکرا ہی ذبح کر ڈالو کہ ہم بے آسرا لوگوں کا بھی بھلا ہو جائے۔'' ---- نانا جان نے جواب دیا ''ہاں ہاں' کیوں نہیں' لیکن میں بوڑھا آدمی ہوں۔ مجھ سے یہ مشقت نہیں ہو گی۔ ابھی ریوڑ چرنے نہیں گیا' نوہرے میں بند ہے۔ تم اٹھو اور اچھا سا جانور پکڑ کر ذبح کر لو اور گوشت بنا لو۔'' کالے خاں نے کہا ''حاجی جی! میں کچی گولیاں نہیں کھیلا۔ آپ کی بات کا مطلب خوب سمجھتا ہوں۔ میں بکرا ذبح کر لوں تا کہ آپ اپنے ادھار کھاتے میں بکرے کی قیمت میرے نام لکھ لیں۔ پھر یہ رقم ادا کر کے ہی میری خلاصی ہو گی۔'' پھر میری طرف متوجہ

ہوکر کہنے لگے ''بھانیا! یہ تو وہی بات ہے ع : منہ کے بڑے دراز....''

میں نے نانا جان کو شرمندگی سے بچانے کے لیے موضوع بدلنے کی غرض سے کالے خاں سے سوال کیا'' آپ شہر شہر گھومے ہیں۔کبھی کراچی بھی جانا ہوا؟''جواب میں گویا ہوئے ''ہاں ایک بار گیا تھا۔پاکستان بننے سے چھ سات برس پہلے کی بات ہے۔وہاں کوئی واقف تو تھا نہیں۔میں کینٹ سٹیشن پر اترا۔باہر نکل کر ایک شخص سے پوچھا۔کراچی کا سب سے بڑا مسلمان سیٹھ کون سا ہے؟اس نے کہا ''سر عبداللہ ہارون''۔میں نے ایک وکٹوریہ پکڑی اور گاڑی والے سے کہا کہ مجھے سیٹھ عبداللہ ہارون کے بنگلے پر لے چلو۔فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ذرا سی دیر میں اس نے مجھے بنگلے کے نیم وا گیٹ پر اتار دیا۔دوپہر کا وقت تھا۔میں بلا جھجک گیٹ میں داخل ہوگیا۔اندر درختوں اور سبزے کے وسیع تختوں سے گھری بنگلے کی عمارت تھی۔میں سیدھا اس کے برآمدے میں پہنچ گیا جہاں ایک چوکیدار بیٹھا اونگھ رہا تھا۔میں نے کڑک کر اس سے پوچھا: ''کدھر ہے تمھارا سیٹھ؟''وہ چونک پڑا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ''شی'' کی آواز نکالی۔گویا خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔میں نے پہلے سے بھی زوردار آواز میں احتجاج کیا''میں کتا ہوں جسے شی شی کر رہے ہو؟اچھا بھلا آدمی تمھیں نظر نہیں آتا؟''اب وہ منت کرنے لگا کہ آہستہ بولو،ساتھ والے کمرے میں سیٹھ صاحب آرام کر رہے ہیں۔میں بدستور بلند آواز میں اس سے بحث کرنے لگا کہ یہ آرام کا کون سا وقت ہے؟تمھارے سیٹھ کو اتنا بھی پتہ نہیں،وغیرہ وغیرہ۔اتنے میں اندر سے کسی نے چوکیدار کو آواز دی۔وہ بھاگ کر اندر گیا۔سیٹھ صاحب نے پوچھا''یہ شور کون کر رہا ہے؟''اس نے بتایا کہ ایک اجنبی ہے۔اسے لاکھ سمجھایا کہ آہستہ بولو لیکن وہ باز ہی نہیں آتا۔سیٹھ صاحب نے غصے میں آکر کہا ''اسے اندر بلاؤ۔''میرا مقصد حاصل ہو چکا تھا۔میں اندر داخل ہوا تو سیٹھ صاحب پلنگ پر دراز تھے۔مجھے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھے اور غضب ناک ہوکر پوچھا''کون ہو

جی تم؟"میں نے تن کر اور گردن کو جھٹکا کر کہا" آدمی۔"یہ انوکھا تعارف سن کر سیٹھ صاحب بے اختیار ہنس پڑے۔غصہ کافور ہو گیا۔کہنے لگے"بیٹھ جاؤ۔"میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔پھر مسکرا کر دریافت کیا:

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"کالے خاں۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"ریاست جودھ پور سے۔"

"کھانا کھاؤ گے؟"

"اور کیا بھوکا رہوں گا؟"

"سیٹھ صاحب نے ملازم کو آواز دی اور کھانا لگانے کو کہا۔ہاتھ پکڑ کر کھانے کے کمرے میں لے گئے۔ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا۔ساتھ ساتھ باتیں ہوتی رہیں۔"

غرض یہ کہ کالے خاں کی گفتگو نے ایسا جادو کیا کہ سر عبداللہ ہارون ریشہ خطمی ہو گئے۔مہمانوں کے لیے مخصوص کمرے میں ٹھہرایا۔نماز ظہر کے بعد بولے"کالے خاں! کچھ دیر آرام کر لو۔پھر عصر کو ایک پارٹی میں جانا ہے۔دونوں ساتھ چلیں گے۔" پارٹی خدا جانے کس سلسلے میں تھی لیکن کراچی کے بڑے بڑے سیٹھ وہاں جمع تھے۔وہ سیٹھ عبداللہ ہارون کے ساتھ ایک اجنبی دیہاتی کو دیکھ کر حیران ہوئے۔سیٹھ صاحب نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا"یہ ہمارے نئے دوست کالے خاں ہیں۔بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔"اور پھر دوپہر کے واقعے کی ساری تفصیل سنائی کہ ان کے یک لفظی جواب سے میرا غصہ دور ہو گیا اور میں خوب ہنسا۔سب لوگوں نے کالے خاں میں دلچسپی لی اور ان سے باتیں کرنے لگے۔ایک صاحب نے جن کو اپنی ظرافت پر ناز تھا' کالے خاں سے مقابلے کی کوشش کی لیکن دو چار فقروں کے تبادلے کے بعد انھیں ان کے کسی

مُسکت جواب پر غصہ آ گیا۔ بگڑ کر بولے ''تم ہم کو کیا سمجھتے ہو جی؟'' جواب ملا ''بے وقوف''۔ سب ہم جلیسوں نے تالی بجا کر داد دی اور تصدیق کرتے ہوئے کہا ''کالے خاں! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ بڑا بے وقوف آدمی ہے۔'' سیٹھ عبداللہ ہارون تو ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ یہ کالے خاں کا کمال تھا کہ چند گھنٹے پہلے جس شہر میں ایک شخص بھی ان کا شناسا نہ تھا اب اسی شہر کا منتخب طبقہ انھیں داد و تحسین کی نظروں سے دیکھ رہا تھا:

جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے ۔۔۔ ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا

سر عبداللہ ہارون تو کالے خاں کے ایسے شیدائی ہوئے کہ دن بھر ساتھ رکھتے۔ جہاں جاتے ساتھ لے جاتے۔ کبھی حاجیوں کے جہاز کی واپسی پر استقبال کے لیے جا رہے ہیں، کبھی کسی جلسے میں، کبھی کسی دعوت میں۔ کالے خاں اپنی آمد کا مقصد تو بتا چکے تھے۔ آٹھ دس دن گزرے تو انھوں نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔ سیٹھ صاحب قیام پر مصر ہوئے۔ چند روز اور گزرے اور کالے خاں کا اصرار بڑھا تو سیٹھ صاحب نے ان کے ساتھ زیرِ تعمیر مسجد کے منصوبے پر تفصیل سے تبادلۂ خیال کیا۔ لوہے کے گارڈر ٹی۔ آر اور سیمنٹ کے تھیلے مال گاڑی کے ذریعے روانہ کیے گئے۔ ایک معقول رقم مسجد کے لیے پیش کی اور کالے خاں کو دوستانہ انداز میں تحائف دیے۔ خود گاڑی پر بٹھانے آئے اور دوبارہ آنے کا وعدہ لے کر انہیں الوداع کہا۔ بعد میں دونوں کے مابین کچھ خط و کتابت بھی ہوئی لیکن تجدیدِ ملاقات کی نوبت نہ آئی۔ اس ضمن میں میرے سوال کے جواب میں کالے خاں نے بتایا ''مجھے کراچی سے آئے ایک سال سے کچھ اوپر کا عرصہ گزرا تھا کہ بمبئی جانا ہوا۔ وہاں اخباروں میں سیٹھ عبداللہ ہارون کی وفات کی خبر چھپی ہے خدا ان پر ہزاروں رحمتیں نازل فرمائے بڑے مخیّر اور مسلمانوں کے ہمدرد انسان تھے۔''

کالے خاں نے یہ داستان ختم کی ہی تھی ایک شخص انھیں بلانے آ گیا۔ شاید

کچھ لوگ انھیں ملنے آئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان سے چرخے والی نظم دوبارہ سن کر لکھ لوں گا لیکن موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ خدا جانے کدھر نکل گئے۔ دو روز بعد میں واپس چلا آیا۔ پھر تین برس بعد جب دوبارہ جانے کا اتفاق ہوا تو کالے خاں کا انتقال ہو چکا تھا۔ ادھر ادھر سے چرخے والی نظم کے بارے میں استفسار کیا تو پتہ چلا کہ وہ نظم غالباً ان کی اپنی موزوں کی ہوئی تھی اور کسی اور شخص کو زبانی یاد نہیں تھی۔

اس قحط الرجال کے زمانے میں جب بھی کسی صاحب کمال شخصیت سے ملاقات میسر آتی ہے تو کالے خاں مرحوم میرے پردۂ تصور پر نمودار ہوتے ہیں اور اپنی دردبھری آواز میں یہ مصرع الاپتے ہیں:

چرکھڑو بھلوای گھڑیورے

----------☆----------

حواشی

۱۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ پنجاب کے چاروں طرف بولی جانے والی زبانوں میں راجستھانی، سندھی، پشتو اور کشمیری میں لفظ ''کاکا'' بالعموم بزرگ اور بالخصوص چچا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ پنجابی زبان کی انفرادیت ہے کہ اس میں یہ لفظ بچے کے لیے بولا جاتا ہے۔

۲۔ کچی زمین پر بیل گاڑیوں وغیرہ کے پہیوں سے راستے کا جو نشان بن جاتا ہے اس کیلئے راجستھان میں مخصوص لفظ ''گذار'' (گاڈی = گاڑی + آر جار) ہے۔ پنجابی میں اسے پیہہ (باہائے خفیفہ) کہتے ہیں۔

۳۔ گواڑی (گئو+واڑی) اصل معنی گایوں کا باڑہ ہے لیکن اصطلاح میں مکان کے چاروں طرف کا کھلا صحن یا احاطہ۔ پرانے شہروں میں اس کے لیے ''گھیر'' کی اصطلاح ملتی ہے۔ گھیر کی حد بندی پختہ دیواروں سے ہوتی تھی یا اردگرد کے مکانوں کی پشت سے۔ کچی دیواروں یا جھڑبیری کے کانٹوں پر مشتمل اونچی باڑوں سے گھرے ہوئے احاطوں کے لیے ''گواڑی'' ہی صحیح لفظ ہے۔ اب یہ لفظ اردو کی کتب لغات سے خارج ہو چکا ہے۔ پلیٹس نے اسے ذرا لطیف صورت میں ''گواری'' لکھا ہے لیکن یہ کیچڑ کو کیچ کہنے والی بات ہے۔

۴۔ ''بھانیا'' ایک جامع لفظ ہے جو بیٹوں' بھتیجوں' بھانجوں اور پوتوں' نواسوں کو مخاطب کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۵۔ اسی طرح ''بائی'' بیٹی' بھتیجی' بھانجی اور پوتی' نواسی کے لیے مخصوص ہے۔

۔ ''نوہرہ'' جانوروں کے لیے مخصوص احاطہ یا باڑہ۔ پنجاب میں حویلی کہتے ہیں۔

۔ سر عبداللہ ہارون کا انتقال ۲۷۔ اپریل ۱۹۴۲ء کو ہوا تھا۔ ان کی قبر کراچی کے قدیم مدرسہ مظہر العلوم (کھڈہ) سے ملحق یتیم خانے کے صحن میں ہے۔ قبر پر ایک خوبصورت چھتری بنی ہوئی ہے۔

شاہ صاحب

یادش بخیر پروفیسر سید محمد رضا مدنی صاحب ۱۹۸۶ء کے آغاز میں گورنمنٹ کالج شیخوپورہ آئے۔ان کی تشریف آوری بالکل آمدم، دیدم، مسخر کردم والا مضمون تھا۔اتنے ملنسار اور کثیر الاحباب شخص بہت کم ہوتے ہیں۔لوگوں کو کھلنے کھلانے کے لیے دو چار ملاقاتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔یہ پہلی ہی ملاقات میں کسی بھی اجنبی کے دل میں جگہ بنا لیتے تھے۔ان کی سحر انگیز شخصیت اوصافِ حمیدہ کی قوس قزح تھی۔صاحبِ علم اور اہل دل، متشرّع اور وسیع المشرب، علمی متانت کے ساتھ زندہ دلی کے پیکر۔ہر وقت دوستوں کے مسائل حل کرنے پر آمادہ اور ضرورت مندوں کی حاجت روائی پر مستعد۔ دسترخوان ان کا بڑا وسیع تھا۔اکثر نیاز فاتحہ کے بہانے احباب کو نوازتے رہتے تھے۔ رمضان شریف میں یہ سلسلہ اپنے عروج پر ہوتا تھا۔آئے دن بیس پچیس آدمی افطاری پر مدعو ہوتے۔طالب علمانہ جستجو ہم دونوں میں قدر مشترک تھی؛ اس لیے عمر میں خاصا تفاوت ہونے کے باوجود ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے۔ایک روز باتوں میں، میں ان سے پوچھ بیٹھا کہ بہاول نگر کا علاقہ نیم ریگستانی ہے۔آپ کے ہاں اونٹ تو ہوتے ہوں گے؟ کہنے لگے: ''ہاں پہلے تو بہت ہوتے تھے، اب ذرا کم ہو گئے ہیں لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' میں نے کہا ''لڑکپن میں کبھی اپنے گاؤں جانا ہوتا تھا تو مجھے اونٹ کی سواری بڑی اچھی لگتی تھی۔'' بولے ''ہمارے گاؤں چلیں، اونٹ کی سواری کروا دیں گے۔'' بات آئی گئی ہوئی۔کچھ عرصہ بعد دسمبر کی چھٹیاں ہوئیں تو انھوں نے

چلنے کا تقاضا کیا۔ میں نے ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ آپ پہلے چلے جائیں، میں دو ایک دوستوں کو لے کر بعد میں آجاؤں گا۔

تعطیلات کے اختتام پر مدنی صاحب واپس آئے، تو شکایت کرنے لگے۔ ایسی شکایات اکثر دوستوں کو مجھ سے رہتی ہیں، اس لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی لیکن جب انھوں نے یہ کہا کہ والد صاحب نے آپ کی خاطر اونٹوں کا انتظام بھی کیا تھا اور پرانی کاٹھیاں نکلوا کر انھیں صاف کروایا تھا تو مجھے بڑی شرمندگی ہوئی۔ ساتھ ہی ان کے والدِ محترم کی اخلاقی عظمت اور مہمان نوازی کا نقش دل پر بیٹھ گیا کہ ایک نادیدہ شخص کے واسطے، جو اُن کے لیے کسی اعتبار سے بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا، انھوں نے کتنا تردّد کیا۔ مجھے ان کی شخصیت سے ایک خاص دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس کے بعد اکثر ان کے بارے میں مدنی صاحب سے گفتگو رہنے لگی اور میں غائبانہ ان کا معتقد ہوتا گیا۔

بالآخر دسمبر ۱۹۸۸ء کی چھٹیوں میں مدنی صاحب کے ہمراہ میں، پروفیسر رانا شجاعت علی، پروفیسر محمد مالک بھٹی اور عزیزی عبدالقیوم بہاول نگر پہنچے۔ ۲۴ دسمبر کی شام تھی۔ ویگن سے اترے تو مدنی صاحب کے سب سے چھوٹے بھائی علی محمد شاہ گاڑی لیے منتظر تھے۔ بہاول نگر سے چند میل دور منچن آباد جانے والی سڑک سے ذرا ہٹ کر سادات کی یہ بستی ان کے ایک بزرگ سید مہر شاہ کے نام سے موسوم ہے۔ اندھیرا پھیلنے سے قبل ہم منزل پر پہنچ گئے۔ یہاں ہم نے پہلی بار اس ہستی کی زیارت کی جس کی باتیں ہم گزشتہ ایک سال سے کرتے اور سُنتے آرہے تھے۔ ان کا اسم گرامی سید نذر حسین شاہ تھا۔ سادگی اور وقار کے اس مجسمے کو دیکھ کر ہم سب کو چپکی سی لگ گئی۔ لیکن شاہ صاحب نے ہمیں محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ ہم ان سے پہلی بار ملاقات کر رہے ہیں۔ ایسی بے تکلفی اور شفقت سے پیش آئے جیسے برسوں سے ہمیں جانتے ہوں۔

میں نے بستی کا سرسری جائزہ لیا جو گنتی کے گھروں پر مشتمل تھی۔ مغربی جانب

مکانات تھے اور بیچ میں ایک بڑا میدان خالی چھوڑ کر مشرق کی طرف شاہ صاحب کا ڈیرہ اور مہمان خانہ واقع تھا۔میدان کے شمال مغربی گوشے میں مسجد اور شمالی جانب مویشیوں کا احاطہ تھا۔جنوب کی سمت بہاول نگر سے آنے والی پختہ سڑک کو راستہ جاتا تھا۔

ہمارا مختصر سامان مہمانوں کے مخصوص کمرے میں رکھ دیا گیا اور چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم ڈیرے کے وسیع وعریض ٹپ کے نیچے آ گئے۔سخت سردی کی وجہ سے ٹپ کے بیچوں بیچ لکڑیوں کا ایک الاؤ روشن تھا۔اس کے گرد ایک دائرے کی صورت میں کرسیاں اور پھر چاروں طرف پچیس تیس چارپائیاں جن کے سرہانے تکیے اور پائنتی کھیس بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔کئی حقے تازہ کیے ہوئے موجود تھے[1]۔

ہمارے میزبانوں اور ان کے کارندوں کے علاوہ آٹھ دس آدمی شاہ صاحب نے ہماری خاطر داری کے لیے دُور و نزدیک سے بلوائے ہوئے تھے۔ان میں نعت خواں ،پنجابی کے شاعر، لطیفہ گو اور مجلس آرائی کا فن جاننے والے لوگ تھے۔ان میں میر احمد علی،صوفی احمد یار (پاک پتن)،محمد شریف چاویکا اور لقمان مدیرا کے نام مجھے اب بھی یاد ہیں۔

عشاء کے بعد ہم لوگ کپڑے وغیرہ تبدیل کرنے اپنے کمرے میں گئے۔اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ شاہ صاحب بنفس نفیس کچھ آدمیوں کے ساتھ کھانے کے خوان اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔مجھے بڑی شرمندگی ہوئی اور میں نے دبی زبان سے اس کا اظہار کیا۔شاہ صاحب تو خاموش رہے لیکن مدنی صاحب نے ،جو میرے ساتھ ہی بیٹھے تھے،میرا کندھا دبا کر اس امر سے باز رہنے کا اشارہ دیا۔کھانا بڑا متنوع اور لذیذ تھا۔ہمارے اصرار کے باوجود شاہ صاحب کھانے میں شریک نہ ہوئے ،اور یہ عذر کیا کہ ذیابیطس کا مرض ہونے کی وجہ سے میں پرہیزی کھانا کھاتا ہوں۔البتہ مدنی صاحب اور حافظ حسن عباس صاحب کو ہمارا ساتھ دینے کا حکم دیا۔کھانے کے دوران میں اگر کسی

چیز کی ضرورت ہوتی تو شاہ صاحب کسی فرزند یا ملازم کو بھیجنے کی بجائے خود تشریف لے جاتے اور مطلوبہ شے لے کر آتے۔ جذبۂ مہمان نوازی کی ایسی مثالیں کتابوں میں تو پڑھی تھیں لیکن ان کا عملی مظاہرہ آپ کی ذاتِ والا صفات میں دیکھا۔ کھانے سے فارغ ہوکر سب لوگ پھر الاؤ کے گرد جمع ہو گئے۔ اب ''کیمپ فائر'' کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ پہلے نعت خوانوں نے اپنے جوہر دکھائے۔ خود شاہ صاحب نے پنجابی نعتیہ اشعار تحت اللفظ سنائے۔ اس کے بعد کافیوں اور پھر مزاحیہ نظموں کی باری آئی۔ چائے کا دور چلنے کے بعد لطیفہ گوئی کی مجلس آراستہ ہوئی۔ اس کا آغاز کہن سال میر احمد علی نے کیا جو شاہ صاحب کا خاندانی میر عالم اور ان کا مزاج شناس تھا۔ اس نے موضع لالیکا کے ایک مرحوم شخص نصیر احمد کھرل عرف نصیرا کی حاضر جوابی کے واقعات سنائے۔ پھر شاہ صاحب کے ایما پر ایک ایک شخص باری باری پُرلطف واقعات اور چٹکلے پیش کرتا۔ شاہ صاحب خود بھی بعض عجیب وغریب کرداروں کا ذکر کرتے اور ان کے حیرت انگیز واقعات سناتے۔ یہ دلچسپ محفل آدھی رات تک جاری رہی۔ پھر شاہ صاحب نے اپنے مہمانوں کو آرام کا موقع دینے کی خاطر اسے برخاست کیا۔ وہ کمرے تک ہمیں چھوڑنے آئے۔ کھڑے کھڑے بستروں وغیرہ کا بہ نظرِ غائر جائزہ لیا کہ کوئی کمی تو نہیں ہے۔ شاہ صاحب مہمان نوازی میں چھوٹی چھوٹی باتوں کا کتنا خیال رکھتے تھے، اس کا اندازہ ایک بات سے لگا لیجیے۔ انھوں نے ہمیں شب بخیر کہہ کر گھر کی طرف جاتے ہوئے مدنی صاحب سے پوچھا کہ مہمانوں میں کوئی صبح کی چائے کا عادی تو نہیں؟ میری اس کمزوری کا مدنی صاحب کو پتا تھا۔

صبح جب مسجد میں فجر کی اذان ہوئی تو میری آنکھ کھل گئی۔ ابھی نماز میں کچھ دیر تھی کہ کمرے کے دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ شاہ صاحب ایک کشتی میں چائے کی تھرماس، پیالیاں، اُبلے ہوئے انڈے اور

بسکٹ وغیرہ اٹھائے کھڑے تھے۔ میں شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ کہنے والا تھا کہ اس وقت آپ نے چائے اور پھر ان لوازمات کی زحمت کیوں کی؟ لیکن مدنی صاحب کا رات والا اشارہ یاد آ گیا' لہٰذا خاموشی میں ہی عافیت سمجھی۔ شاہ صاحب چائے کی کشتی میرے حوالے کر کے تیز تیز قدموں سے مسجد کی طرف چلے گئے۔

مدنی صاحب نمازِ صبح سے فارغ ہو کر آئے تو میں نے ان سے یہ تذکرہ کیا۔ بولے "آپ نے بہت اچھا کیا کہ شاہ صاحب سے کچھ نہیں کہا ورنہ اس کے نتائج خطرناک ہو سکتے تھے۔" اور پھر انھوں نے ان ضمن میں چند عبرت ناک واقعات سنائے: ع گرنستانی بہ ستم می دھد

ناشتے سے فراغت پا کر ہم لوگ ٹوبہ قلندر شاہ میں مدنی صاحب کے پھوپھا حاجی سید غلام مجتبیٰ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری دینے گئے۔ حاجی صاحب بڑے جمالی بزرگ تھے۔ حسنِ صورت اور حُسنِ سیرت کا مجموعہ۔ بہت بڑے زمیندار ہونے کے باوجود مزاج میں انکسار بہت تھا۔ بڑی محبت سے پیش آئے۔ اپنے صاحبزادگان سید محمد احمد شاہ (سابق ایم۔ این۔ اے) اور سید احمد نواز شاہ سے ملایا۔ چائے سے تواضع کی۔ اگلے دن دوپہر کے کھانے کی دعوت بھی دی۔ مدنی صاحب نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ کل تو ان لوگوں کو موضع فدائی شاہ میں حضرت سید جلال شاہؒ کے مزار کی زیارت کرانے اور پھر موضع روڈو نیز ہندوستان کی سرحد پر واقع اراضی دکھانے کا پروگرام ہے۔ حاجی صاحب نے فرمایا کہ سخت سردی کا موسم ہے۔ آپ کو گھر سے نکلتے نکلتے دس گیارہ بج جائیں گے۔ دوپہر کا کھانا میرے ساتھ ذرا جلدی کھا لینا۔ اس کے علاوہ یہاں سے کوئی بڑی گاڑی لے جانا تاکہ کچے اور ریتلے راستوں میں پریشانی نہ ہو۔ اتنی شفقت کے سامنے مدنی صاحب نے ہتھیار ڈال دیئے۔ چنانچہ یہی پروگرام طے ہوگیا۔ ظہر کے وقت بستی مہر شاہ واپسی ہوئی۔ شاہ صاحب کھانے میں تاخیر کے خیال

سے متفکر بیٹھے تھے۔کھانے کے بعد ہم نے شاہ صاحب کے مویشی خانے کا معائنہ کیا۔ایک چکر بستی کے اردگرد واقع زمینوں کا لگایا۔رات کوحسبِ سابق "کیمپ فائر" سے لطف اندوز ہوئے۔

اگلی صبح بھی فجر کی چائے شاہ صاحب خود لے کر آئے۔اب چوں چرا کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ناشتہ ذرا تاخیر سے ملا اور یہ ناشتہ نہیں بلکہ مجموعہ تھا ناشتے اور دوپہر کے کھانے کا۔میرے استفسار پر شاہ صاحب نے فرمایا "آج تم لوگ دُور کی سیر کو جاؤ گے ،خدا جانے کب واپسی ہو۔اس لیے خوب سیر ہوکر جاؤ تاکہ بھوک نہ لگے۔"لیکن جب ہم روانہ ہونے کے لیے گاڑی میں بیٹھے تو اصل بھید کھلا۔شاہ صاحب گاڑی کے پاس آئے اور بڑی سنجیدگی سے بولے"اپنی ہی گاڑی میں جانا اور کھانا واپس گھر آ کر کھانا۔"ہم سب نے کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔کہہ بھی کیا سکتے تھے۔دراصل ہمارے حاجی صاحب کے ساتھ طے کردہ پروگرام کی انھیں بھنک پڑ چکی تھی۔یہ بات نہ تھی کہ حاجی صاحب سے انھیں کوئی پرخاش ہو۔دونوں بزرگوں میں قریبی عزیز داری اور خوش گوار مراسم تھے۔حقیقت یہ تھی کہ اپنے مہمانوں کے معاملے میں وہ بے حد حساس تھے۔اس کا ثبوت ایک اور بات سے فراہم ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کی تین بیگمات بستی مہر شاہ میں الگ الگ مکانات میں مقیم تھیں۔ماشاء اللہ نو صاحبزادے تھے۔پہلی بیگم سے ایک۔دوسری بیگم سے ،جو مدنی صاحب کی والدہ تھیں،تین اور تیسری بیگم سے پانچ۔ظاہر ہے کہ ہم مدنی صاحب کی وساطت سے شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ہمارے چند روزہ قیام میں مدنی صاحب نے بڑی کوشش کی کہ کم از کم ایک وقت کا کھانا اپنی طرف سے کھلا دیں لیکن شاہ صاحب نے بڑی سختی سے ان کی یہ درخواست رد کر دی۔فرمانے لگے"مدنی شاہ! یہ میرے مہمان ہیں۔میں کسی اور کو ان کی دعوت کی اجازت نہیں دے سکتا اور ان

میں تم بھی شامل ہو۔"

غرض یہ کہ ہم حاجی صاحب سے معذرت کرتے ہوئے آگے نکل گئے۔اس دن ہم لوگ مغرب کے قریب واپس لوٹے۔رات کو"کیمپ فائر" کے دوران شاہ صاحب نے فرمایا"شیرانی صاحب !اونٹ پہنچ گئے ہیں۔صبح ناشتے کے بعد سواری کا شوق پورا کرلیں۔"

اونٹ صاف ستھرے اور صحت مند تھے لیکن اس سے زیادہ خوشی مجھے ان کی کاٹھیاں دیکھ کر ہوئی جو بالکل بیکانیری انداز کی تھیں اور ان پر نقرئی کام کیا ہوا تھا۔ایک کاٹھی ،جو شاہ صاحب کے ذاتی استعمال میں رہی تھی، بے حد نفیس تھی۔رانا شجاعت علی اور مالک بھٹی دونوں اس تجربے سے گھبرا رہے تھے۔البتہ عزیزی عبدالقیوم جودھپور میں دو تین بار میرے ساتھ سواری کر چکا تھا۔میں نے ایک اونٹ پر،جو زیادہ قد آور تھا،بیٹھ کر رانا صاحب کو پیچھے بٹھایا۔دوسرے پر عبدالقیوم اور پیچھے بھٹی صاحب بیٹھے۔مدنی صاحب نے ایک گھوڑے پر سوار ہوکر ہمارا ساتھ دیا۔شاہ صاحب کے مشورے پر ہم نے دریائے ستلج کی طرف اونٹ دوڑا دیے جو وہاں سے شمال کی جانب کوئی دو میل کے فاصلے پر تھا۔

لوٹ کر آئے تو بستی کے وسطی میدان میں ایک ازدحام تھا۔معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے ہماری تفریح کی خاطر بھانڈوں کا طائفہ بلوایا ہوا ہے۔"اکھاڑہ" کا آغاز ہونے پر پہلے تو کچھ دیر گانے بجانے کا مظاہرہ کیا گیا،اور پھر نقلوں کی باری آئی۔ بلاشبہ یہ طائفہ اپنے فن میں پوری مہارت رکھتا تھا۔نقلوں کا سلسلہ خاصی دیر تک جاری رہا۔ابھی یہ ختم نہ ہونے پایا تھا کہ اچانک جنوبی سمت سے ایک جیپ نمودار ہوئی اور میدان میں آکر رک گئی۔گاڑی سے غلام مجتبیٰ شاہ صاحب اُترے۔شاہ صاحب کے ساتھ ہم بھی ان کے خیر مقدم کو بڑھے۔وہ تجدیدِ ملاقات کے لیے تشریف لائے

تھے۔اللہ اللہ! کیا ٹھکانہ ہے وضع داری کا۔حاجی صاحب کے ساتھ نہایت پُر لطف صحبت رہی ۔مغرب سے ذرا پہلے وہ رخصت ہوئے۔

یہ ہمارے قیام کی آخری رات تھی۔چنانچہ ''کیمپ فائر'' رات ایک بجے تک جاری رہا۔شاہ صاحب مزید قیام پر اصرار کرتے رہے لیکن یہ بڑا مشکل تھا۔بچھڑنے کا ملال شاہ صاحب کے چہرے سے عیاں تھا۔ایسے محبت کرنے والے لوگوں اور بالخصوص شاہ صاحب جیسی مہربان ہستی سے جدا ہونے کو ہماری طبیعت بھی نہیں چاہتی تھی،لیکن مجبوریوں کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔صبح جب روانہ ہونے کے لیے سب سے مل کر اور شاہ صاحب کی دست بوسی کر کے ہم گاڑی میں بیٹھے تو شاہ صاحب کے حکم پر دو گانے والوں نے ان کے جذبات کی ترجمانی یہ الوداعی نظم سنا کر کی:

دس وے پروہنیا توں فیر کمدوں آویں گا

چھیتی چھیتی آویں بُھا چِر تے نہ لاویں گا

ہم نے اس محبت بھرے اظہار کے جواب میں دوبارہ آنے کا وعدہ کیا اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ رخصت ہوئے۔علی محمد شاہ اور حافظ حسن عباس صاحب ہمیں بہاول نگر چھوڑنے آئے۔

واپس گھر آ کر یہ چند روزہ قیام ایک خواب سا معلوم ہوتا تھا۔ہمارے ساتھ جو سلوک ہوا،وہ ایسا ہی تھا جیسا ہارون الرشید نے ابوالحسن کو بادشاہ بنا کر اس کے ساتھ روا رکھا تھا۔۱۹۹۵ء میں میری ملازمت سے سبکدوشی کے موقع پر مدنی صاحب نے جو مضمون پڑھا،اس میں اس قیام کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا تھا:

''والد مرحوم بڑی جلالی طبیعت کے مالک تھے مگر شیرانی صاحب نے اس طرح انھیں مسحور کیا ہوا تھا کہ وہ ۲۴ گھنٹوں میں سے تقریباً پندرہ یا سولہ گھنٹے ان کے پاس بیٹھے رہتے۔''

میں پوری دیانت داری سے عرض کرتا ہوں کہ مجھ جیسے ناکارہ شخص سے شاہ صاحب کا یہ شاہانہ سلوک دراصل ان کے کردار کی عظمت اور جذبۂ مہمان نوازی کا عملی اظہار تھا اور بس۔محترم شاہ صاحب نے اس کے بعد بھی مجھے ہمیشہ یاد رکھا۔مدنی صاحب جب بھی چھٹیوں میں گھر جاتے تو شاہ صاحب ان کے ہاتھ کوئی نہ کوئی تحفہ مجھے ارسال کرتے۔ان کی عطا کردہ ایک نفیس دیسی جوتی اب بھی میرے پاس موجود ہے۔دوتین بار کسی مصروفیت کے سبب لاہور آئے تو شیخوپورہ مدنی صاحب کے پاس مختصر وقت کے لیے تشریف لائے۔ان موقعوں پر بھی ان کے نیاز حاصل ہوئے بلکہ دوبارانھوں نے میرے غریب خانے پر قدم رنجہ فرما کر میری عزت افزائی بھی کی۔

بستی مہر شاہ ہمارے شاہ صاحب کے پردادا سید مہر شاہ نے بسائی تھی۔ان کے چھوٹے صاحبزادے شاہ صاحب کے جدِ امجد سید بلند شاہ تھے۔شاہ صاحب کے والد ماجد سید باغ علی شاہ بڑے زمیندار ہونے کے باوجود بہت سیدھے سادے اور مرنجان مرنج شخصیت کے مالک تھے۔انہوں نے ۱۹۵۸ء میں وفات پائی۔اس خاندان نے پیری مریدی کو کاروبار کبھی نہیں بنایا۔سید نذر حسین شاہ صاحب اپنے والد کی واحد نرینہ اولاد تھے۔ان کی تاریخ ولادت ۸- اکتوبر ۱۹۲۳ء ہے[۳]۔ظاہر ہے کہ اکلوتے فرزند کی پرورش بڑے لاڈ پیار سے ہوئی ہوگی۔شاہ صاحب ظاہری تعلیم کا سلسلہ آٹھویں جماعت سے آگے جاری نہ رکھ سکے۔میرے خیال میں اس کا سبب تعلیم سے ان کی بے رغبتی نہیں بلکہ کچھ اور تھا۔ ہمارے دیہی معاشرے میں افرادی قوت کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔یہ گھرانا اس اعتبار سے محرومی کا شکار تھا۔ادھر شاہ صاحب کے والد صحیح معنوں میں درویشِ خدا مست تھے۔دنیاوی معاملات سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بڑے زمینداروں کی طرح تھانہ کچہری جانے کے روادار نہ تھے۔سادگی کا یہ عالم تھا کہ سالن کی بجائے دودھ یا چھاچھ سے روٹی کھانا زیادہ پسند کرتے تھے۔اپنی وسیع اراضی کا

بندوبست بھی ان کے بس کا روگ نہ تھا۔قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اردگرد کے دوسرے زمیندار ان کی اراضی کے قطعات غصب کرنے کی کوشش بھی کرتے ہوں گے۔ یہ حالات ہمارے شاہ صاحب کے سامنے ایک چیلنج بن کر آئے اور اس کے مقابلے کے لیے انھیں اپنی تعلیم کو خیر باد کہنا پڑا۔اس دور کا ایک دلچسپ واقعہ یہاں درج کرتا ہوں۔

علاقے کا ایک زمیندار اس خاندان کو ہر طرح زک پہنچانے میں کوشاں رہتا تھا۔شاہ صاحب تعلیم چھوڑ کر نئے نئے میدانِ عمل میں آئے تھے۔ انھوں نے جوابی کارروائی کے طور پر اس زمیندار کے مویشی نکلوا دیے۔ اس کارروائی کی اطلاع ان کے والد کو ہوئی تو انھیں بڑا صدمہ ہوا۔اتفاق سے ان کا کوئی دوست زمیندار ملنے کے لیے آیا تو اس سے اس بات کی شکایت کی کہ ''دیکھو ایک ہی لڑکا ہے اور وہ بھی بگڑا جا رہا ہے۔تم اس کو سمجھاؤ کہ یہ کام ہمیں زیب نہیں دیتے۔'' یہ ناصح مشفق دیہی ماحول کے عملی تقاضوں کو خوب سمجھتا تھا' لہٰذا اس نے اپنے دوست کے فرزند کو ان الفاظ میں نصیحت کی کہ ''شاباش نذر حسین شاہ! یہ سلسلہ جاری رکھنا ورنہ مخالفین تمھیں چین نہیں لینے دیں گے۔'' لیکن شاہ صاحب کو یہ تجربہ دُہرانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی بہرحال اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے ایسی ثابت قدمی اور مدبرانہ صلاحیت سے کام لیا کہ حاسد مایوس ہو کر بیٹھ رہے۔اس کامیابی کا ایک ثبوت یوں بھی ملتا ہے کہ ایک عرصے بعد جب شاہ صاحب حج کو گئے اور وہاں بیمار پڑ گئے تو علاقے میں ان کی وفات کی افواہ پھیل گئی۔مخالفین نے زمینوں پر قبضہ جمانا شروع کیا۔حضرت باغ علی شاہ صاحب کے پاس شکایات پہنچیں تو انھوں نے فرمایا ''اگر نذر شاہ واپس آ گیا تو وہ خود ہی ان لوگوں سے نمٹ لے گا۔اور اگر واپس نہ آیا تو مجھے ان زمینوں کا کیا کرنا ہے؟'' اور پھر جب شاہ صاحب کے واپس کراچی پہنچنے کی اطلاع آئی تو یہ لوگ اپنی کاشت کردہ فصلیں چھوڑ کر رفو چکر ہو گئے۔

شاہ صاحب کی شادیوں کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔ابھی نوعمر ہی تھے کہ ان کے والد صاحب نے اپنی حقیقی بھانجی سے ان کی شادی تجویز کی۔ انھیں خاموش دیکھ کر فرمایا کہ ''بھئی تم اپنی پسند کی شادی بعد میں مرضی سے کرلینا۔'' چنانچہ پہلی شادی ہوگئی۔چند برس گزرے تو والدہ محترمہ نے اپنی حقیقی بھتیجی سے شادی کی تجویز دے دی[۵]۔ اس بار بھی شاہ صاحب نے خاموشی اختیار کی۔چنانچہ والدہ صاحبہ نے بھی وہی رخصت دی کہ بعد میں اپنی مرضی کی شادی کرلیں۔اب ظاہر ہے کہ شاہ کی تیسری شادی کو دراصل والدین کی فرماں برداری کا ایک پہلو ہی سمجھنا چاہیے۔

سید باغ علی شاہ صاحب حضرت خواجہ اللہ بخش تونسوی قدس سرہ سے بیعت تھے[۶]۔لیکن اپنے فرزند کو انھوں نے چشتیاں شریف میں قبلۂ عالم حضرت نور محمد مہارویؒ کی درگاہ کے سجادہ نشین حضرت میاں محمود بخش مہاروی سے بیعت کروایا[۷]۔

۱۹۵۷ء میں ہمارے شاہ صاحب اپنے متعدد اعزہ واقربا کی معیت میں،جن میں خواتین اور بچے بھی شامل تھے،مولانا جان محمد کی رہنمائی میں ۳۳۵ افراد کے ایک بڑے قافلے کے ساتھ حج وزیارت کی غرض سے تشریف لے گئے۔یہ قافلہ کراچی سے بحری جہاز کے ذریعے بصرہ کی بندرگاہ پر اترا۔وہاں سے بغداد شریف،کربلائے معلیٰ، نجف اشرف،دمشق اور بیت المقدس ہوتا اور زیارتیں کرتا ہوا مدینہ منورہ پہنچا۔پھر مکہ معظمہ میں حج کا فریضہ ادا کر کے دوبارہ مدینہ شریف آیا۔یہاں سے جدہ اور وہاں سے سمندر کے راستے کراچی واپس ہوا۔اس طویل سفر میں کوئی چھ ماہ صرف ہوئے۔

شاہ صاحب اوائلِ عمر ہی سے نماز روزہ کے پابند تھے۔نماز اکثر مسجد میں باجماعت ادا کرتے۔زندگی کے آخری برسوں میں ذیابیطس میں مبتلا ہونے کے باعث ڈاکٹر روزہ رکھنے سے منع کرتے تھے۔پھر بھی وہ خاص خاص روزے رکھ لیتے تھے۔ وفات سے دو روز پیشتر بھی نفلی روزہ رکھا۔نماز تراویح باقاعدہ جماعت کے ساتھ

ادا کرتے۔ جب ان کے فرزند حافظ سید حسن عباس نے حفظِ قرآن کی سعادت حاصل کرلی تو ان کی اقتدا میں تراویح پڑھتے تھے۔ تلاوتِ قرآن پاک معمول تھا۔ عام حالات میں ایک منزل روزانہ پڑھ کر ایک ہفتے میں قرآن ختم کر لیتے تھے۔ درود اور وظائف اس پر مستزاد تھے۔

دینی شعائر کی اس پاس داری کے باوجود بڑے وسیع المشرب تھے۔ اگرچہ اولیائے کرام اور مشائخ عظام سے عقیدت ان کا شیوہ تھا لیکن ہر مکتبِ فکر کے علما کا احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ عاشورہ کے دن مولانا جمال دین کو، جن کا تعلق اہل حدیث مسلک سے تھا، بلوا کر وعظ کراتے۔ ایک بار تبلیغی جماعت کے ساتھ بھی نکلے۔

تعلیم کا سلسلہ ادھورا رہ جانے کے باوجود ان کا شعری ذوق بڑا بلند تھا۔ حافظہ قوی ہونے کی وجہ سے پنجابی، اردو اور فارسی اشعار کثرت سے یاد تھے، جنھیں موقع کی مناسبت سے پڑھا کرتے تھے۔ خواجہ غلام فریدؒ کی کافیاں اور حضرت مہر علی شاہ کے کلام سے خصوصی مزاولت تھی۔ مولوی غلام رسول کی احسن القصص، مولوی عبدالستار کی قصص المحسنین اور ہیر وارث شاہ کا بڑے اشتیاق سے مطالعہ کرتے۔ شاہ صاحب بڑی بھرپور شخصیت کے مالک تھے۔ بہت سی خوبیاں انھیں اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی تھیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ لڑکپن ہی سے انھیں جس مخالفانہ ماحول اور جن کٹھن حالات کا سامنا کرنا پڑا، اس نے ان کی شخصیت کو کندن بنا دیا تھا۔ ان کے اوصافِ حمیدہ میں سے مہمان نوازی کا تذکرہ میں اوپر کر چکا ہوں۔ مہمان نوازی کی جڑواں صفت سخاوت ہے اور یہ بھی شاہ صاحب کے کردار میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ مفلسوں اور ناداروں کی کھلی اور پوشیدہ امداد ان کا شیوہ تھا۔ غریب لوگوں کو دودھ پینے کے لیے شِیر دار بھینسیں اس شرط پر دے دیتے تھے کہ جب دودھ سوکھ جائے تو واپس کر دینا۔ غریب کسانوں کو ہل چلانے کے لیے بیل بھی دے دیتے تھے۔ اگر کوئی ضرورت مند قرض طلب کرتا تو حسبِ توفیق

رقم دے کر اسے کہتے کہ یہ واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔ کسی سائل کو حتی الامکان خالی نہیں لوٹاتے تھے۔ اپنے فرزند حافظ حسن عباس کی شادی کے موقع پر فرمانے لگے کہ ''میرے بھی کچھ مہمان ہیں۔ انھیں بھی کھانا کھلانا ہے۔'' منتظمین نے یہ سمجھ کر کہ دو چار آدمی ہوں گے طعام گاہ میں بلوانے کو کہا۔ شاہ صاحب نے جتنے گداگر اور مفلوک الحال لوگ باہر جمع تھے، سب کو بلا لیا۔ منتظمین گھبرا گئے اور شاہ صاحب سے احتجاج کیا۔ آپ نے فرمایا ''تمھارے مہمان تو متموّل لوگ ہیں۔ ہر روز اچھے کھانے کھاتے ہیں۔ اصل مستحق میرے یہ مہمان ہیں جنہیں قسمت سے ایسا کھانا میسر آتا ہے۔'' موضع فدائی شاہ کے معروف بزرگ حضرت سید جلال سخاوت میں ان کے لیے مثالی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی سخاوت کے عجیب وغریب واقعات بڑی محبت اور عقیدت سے سناتے تھے۔

شاہ صاحب کو اپنی زرعی زمین سے بڑا لگاؤ تھا۔ زندگی میں بعض مراحل پر انھیں مالی مشکلات پیش آئیں لیکن انھوں نے زمین فروخت نہیں کی بلکہ اپنے والد سے وراثت میں ملی ہوئی اراضی میں اضافہ ہی کیا۔ اچھی قسم کی بھینسوں اور عمدہ نسل کے گھوڑوں کا شوق انھیں والد سے ورثے میں ملا تھا۔ زمین کی طرح بھینس فروخت کرنا بھی گناہ سمجھتے تھے۔ یوں اونٹ، گائیں اور بکریاں بھی رکھتے تھے لیکن ان کی فروخت پر کوئی پابندی نہ تھی۔ جانوروں کی پرورش اولاد کی طرح کرتے تھے، اور اسے ثواب سمجھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یتیموں، مسکینوں اور قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی جو تاکید کی ہے، محض جانوروں کی اچھی طرح پرورش کرنے سے اس پر عمل ہو جاتا ہے کیونکہ یہ یتیم بھی ہیں، مسکین بھی اور قیدی بھی۔ اپنی سواری کے جانوروں پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ ان کے لیے قیمتی زینیں، کاٹھیاں، لگامیں، مہاریں بلکہ چاندی کے زیور بھی بنوائے ہوئے تھے۔ یہی ایک شوق تھا جس پر وہ اسراف کی حد تک خرچ کر دیتے

تھے ورنہ نہایت سادہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔کھلانے کا شوق ضرور تھا لیکن کھانے کا نہیں۔لباس سادہ مگر صاف ستھرا پہنتے تھے۔عموماً سفید کرتا اور تہبند پسند کرتے۔سر پر عمامہ باندھتے تھے۔مجھ سے خود فرمایا کہ میں نے کبھی بنیان یا سویٹر نہیں پہنا۔گرمی کے موسم میں باریک پٹکا رکھتے اور سردیوں میں گرم چادر یا کھیس اوڑھ لیتے تھے۔سنہری یا روپہلی تِلّے والی دیسی جوتی مرغوب تھی۔اس کے بھی دو جوڑے رکھتے۔ ایک نیا کہیں آنے جانے کے لیے اور دوسرا پرانا گھر پر استعمال کے لیے۔اگر موچی تیسرا جوڑا بنا کر لے آتا تو پہلے والوں میں سے ایک فوراً کسی کو دے ڈالتے تھے۔

عمر کے ساتھ ساتھ قویٰ مضمحل ہونے لگے تو اونٹ اور گھوڑے کی سواری کم کردی تھی۔شہر وغیرہ جانے اور وقت بچانے کی خاطر موٹر سائیکل، جیپ یا کار رکھنے لگے۔لیکن خود کبھی نہیں چلاتے تھے۔ان کے سیکرٹری اور ڈرائیور حافظ حسن عباس تھے۔

مجھے پوری کوشش کے باوجود شاہؒ صاحب کی شخصیت میں کسی قسم کا ابہام یا الجھاؤ (Complex) نظر نہیں آیا۔بڑے بے باک اور صاف گو آدمی تھے اور کوئی لگی لپٹی رکھنے کے قائل نہ تھے۔مصلحت بینی کو بزدلی سمجھتے تھے۔بردبار ایسے کہ زمانے کے سردگرم سے چنداں متاثر نہیں ہوتے تھے۔نہ خوشی میں آپے سے باہر ہوتے نہ غم میں بے صبری کا مظاہرہ کرتے۔خود دار ایسے کہ اپنے مسائل اپنے ہی وسائل سے حل کرتے اور کسی کا احسان اٹھانا تو دُور کی بات ہے، معمولی امداد واعانت تک کے خواہاں نہ ہوتے۔سیر چشمی کی یہ حالت کہ کسی بڑے سے بڑے آدمی کے عہدے یا دولت سے ذرا مرعوب نہ ہوتے تھے البتہ اہل علم اور درویشوں کی صحبت میں خوش رہتے اور ان کی خدمت سے مسرت محسوس کرتے۔ان کے پاس ہر قسم کے لوگ آتے تھے لیکن خود کسی کے ہاں جانے سے گریز کرتے۔ہاں جو لوگ انھیں کسی وجہ سے پسند ہوتے تھے،ان کے ہاں جانے سے پرہیز نہ تھا۔عیادت اور تعزیت کے لیے مخالفین کے ہاں بھی چلے

جاتے تھے۔وضعداری کا وہ عالم کہ جس کسی سے ایک بار تعارف اور تعلق ہوگیا اس کو آخر تک نبھایا۔دوستی اور دشمنی دونوں میں بڑے ثابت قدم تھے۔ہر جمعہ کو اپنے والدین اور دیگر اعزّہ کی قبور پر فاتحہ پڑھنے گورستان جانے کا معمول تھا۔اس میں کبھی فرق نہیں آنے دیا۔اپنے پیر خانے چشتیاں شریف کے سالانہ عرس میں التزام کے ساتھ شریک ہوتے تھے اور سجادہ نشین کی خدمت میں مقررہ نذر پیش کرتے۔

شاہ صاحب کو علم القیافہ میں بھی درک حاصل تھا۔بظاہر تو اس کا سبب زندگی کے میدان میں ان کی جدوجہد، تجربات کی وسعت اور مشاہدے کی گہرائی کو سمجھنا چاہیے لیکن میں نے جو واقعات سنے اور جو محدود تجربہ میسر آیا،اس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اس معاملے میں چھٹی حس کی کارفرمائی بھی شامل تھی۔مثلاً ایک شخص خاص ارادے سے آیا۔شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچ کر ابھی اس نے اِدھر اُدھر کی کوئی بات شروع کی کہ شاہ صاحب نے اس کا اصل مقصد بھانپ کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔حاضرین تو کیا سمجھتے خود گفتگو کا آغاز کرنے والا حیران رہ جاتا کہ میرا منشا شاہ صاحب کو کیسے معلوم ہوگیا۔ان کے فرزندوں کا بھی کہنا ہے کہ ہم شاہ صاحب سے کوئی معاملہ کتنا ہی پوشیدہ رکھتے ان پر وہ عیاں ہوجاتا تھا اور ہمیں اس وقت تعجب ہوتا جب وہ اس بارے میں اپنا موقف ہم پر صریحاً یا اشارۃً واضح کردیتے۔اب آپ اسے علم القیاس سمجھیں یا قیافہ شناسی، میں تو اسے فراستِ مومن کہوں گا۔مجھے یاد آیا کہ شاہ صاحب نے اپنی شبینہ محفلوں میں پاک پتن کے نواح کی ایک مرحوم شخصیت (غالباً) شاہ نواز چشتی کا تذکرہ کیا تھا جس میں یہ صفت حدِ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔میں سمجھتا ہوں کہ فراست میں یہ صاحب شاہ صاحب کے لیے اسی طرح مثالی حیثیت رکھتے تھے جیسے سخاوت میں حضرت سید جلال شاہ علیہ الرحمتہ۔

شاہ صاحب کے مزاج کا واحد پہلو جسے بظاہر مثبت کہنے میں تامل ہوسکتا

ہے،وہ ان کی برافروختگی تھی جسے مدنی صاحب ''جلالی طبیعت'' سے موسوم کرتے تھے۔ جب ان کا مزاج برہم ہوجاتا تو وہ ایک دم بھبک اُٹھتے تھے اور گرج دار آواز میں ایسی بے نقط سناتے کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ میرے تجزیے کے مطابق شاہ صاحب کو یہ شدید غصہ صرف ایسی باتوں پر آتا تھا جو انہیں سخت ناپسند تھیں؛ مثلاً جھوٹ، منافقت، چالاکی اور حماقت۔ اس قسم کی باتوں سے ان کے ذہن کا توازن بگڑ جاتا تھا اور وہ گالیاں دے کر اسے متوازن کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ خوبی یہ تھی کہ اگر ان کے غصے کا نشانہ بننے والا شخص اپنی غلطی کا اعتراف کرلیتا یا کم از کم اس کے اظہار کی غرض سے سر جھکا کر خاموش ہوجاتا تو ان کا غصہ فوراً کافور ہوجاتا تھا۔ ایک اور طریقہ بھی تھا لیکن وہ مشکل تھا اور بڑا ذہین اور حاضر جواب آدمی ہی اس سے کام لے سکتا تھا۔ اس کی ایک مثال میر احمد علی مرحوم نے مجھے سنائی تھی۔

ہوا یوں کہ ایک بار شاہ صاحب نے احمد علی کی ڈیوٹی لگا دی کہ روزانہ مغرب کے وقت ڈیرے میں لالٹین جلایا کرے۔ اتفاق سے ایک دن شاہ صاحب کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ احمد علی ڈیرے پر موجود دوسرے لوگوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ گیا۔ تاش میں وقت گزرنے کا تو پتا ہی نہیں چلتا۔ مغرب کی اذان کانوں میں پڑی تو احمد علی کو ہوش آیا۔ جلدی سے اٹھ کر بتی جلانے لگا تو اس نے جلنے سے انکار کردیا۔ لالٹین کو ہلا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ تیل ختم ہو چکا ہے۔ وہ میدان کے دوسرے سرے پر واقع دکان کی طرف بھاگا۔ اسی اثنا میں شاہ صاحب گھوڑے پر سوار آپہنچے۔ احمد علی کو لالٹین اٹھائے بھاگتے دیکھ کر سارا معاملہ سمجھ گئے۔ اس کی لاپروائی پر غصہ جو آیا تو ایک موٹی سی گالی لڑھکا دی۔ شاید ابھی بہت کچھ عطا ہوتا لیکن احمد علی نے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ پہلی قسط وصول کرتے ہی لالٹین زمین پر رکھ دی اور دعائیہ انداز میں دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر زور سے پکارا ''آمین'' شاہ صاحب ہنس پڑے اور معاملہ رفت گزشت

ہوا۔

یوں بھی ان کا غصہ جس تیزی سے چڑھتا تھا، اسی رفتار سے اُتر بھی جاتا تھا اور وہ پھر سے شفیق اور مہربان ہو جاتے تھے۔ ناواقف لوگوں کو ان کا غصہ بڑا خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جاننے والوں کو پتہ تھا کہ یہ سب کچھ بادل کی دل دہلا دینے والی گرج کی مانند ہے جس کے بعد بارانِ رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ کچھ واقفِ حال تو جان بوجھ کر غلطی کرتے اور گالیاں کھاتے تھے۔ ہم لوگوں کے قیام کے دوران میں بعض ساتھی مدنی صاحب سے شاہ صاحب کے غصے کا مظاہرہ کروانے کی فرمائش بھی کرتے رہے لیکن اس کے لیے کوئی ''معمول'' فراہم نہ ہو سکا۔

بایں ہمہ شاہ صاحب کے مزاج میں خشکی اور خشونت نہ تھی۔ خوش مزاج تھے اور ہنسی مذاق سے کام لیتے تھے۔ لطیفہ گوئی کے شوقین تھے لیکن بیہودہ مذاق پسند نہیں کرتے تھے۔ آتشی محفلوں میں انھوں نے بیسیوں لطیفے سنائے۔ عام گفتگو کے دوران میں بھی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے تھے۔ ایک شخص اپنے خانگی حالات کی شکایت لے کر آیا۔ اسے سمجھاتے ہوئے کہنے لگے: ''دیکھو قرآن پاک میں آیا ہے **مابین ایدیھم** یعنی ماں، بھین، دھی کا لحاظ کرو۔'' ایک رات مجلس میں جمہوریت کا ذکر آیا تو شاہ صاحب نے اس کی بڑی سادہ اور جامع تعریف پیش کی۔ فرمایا ''بھئی ہم تو جمہوریت کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ اسمبلی کے سو میں سے اکیاون اراکین اس بات پر اتفاق کر لیں کہ خدا موجود نہیں تو پوری قوم کو یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی اور خدا کا اثبات قابلِ تعزیر جرم ٹھہرے گا۔''

بعض اوقات گفتگو میں کنائے سے کام لیتے تھے جو انجان آدمی کے لیے سمجھنا مشکل ہوتا تھا۔ ایک دن اپنے فرزندوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے مجھ سے فرمانے لگے: ''شیرانی صاحب! آٹھ تو میرے بیٹے ہیں اور ایک میرا باپ ہے۔'' میں

سمجھ گیا کہ یہ اشارہ سید محمود اشرف شاہ کی طرف ہے جنھیں شاہ صاحب کی جلالتِ طبع سے بہرۂ وافر عطا ہوا ہے اور ان میں شاہ صاحب سے علی الاعلان اختلاف کی جرات بھی ہے۔ بعد میں مَیں نے مدنی صاحب سے پوچھا تو انھوں نے میرے اندازے کی تصدیق کی۔

شاہ صاحب پر میرا یہ مضمون شاید آپ کو طویل محسوس ہو لیکن اس میں میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں، بلکہ یہ ان کی متنوع اور ہمہ صفت موصوف شخصیت کا کمال ہے۔ میں نے اختصار سے کام لیا ہے ورنہ ان پر ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

اختتام سے قبل شاہ صاحب کے سفرِ آخرت کے بارے میں کچھ عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ اس واقعۂ فاجعہ کا ایک افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان کے وصال سے دس روز قبل یعنی ۲۰ جنوری ۱۹۹۲ء کی شام کو مجھے دل کا سخت دورہ پڑا اور میں ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال کے شعبۂ امراضِ قلب میں داخل[۴] ہو گیا۔ عیادت کے لیے آنے والے احباب میں مدنی صاحب پیش پیش ہوتے تھے۔ ۳۰ جنوری کی شام کو میں نے محسوس کیا کہ مدنی صاحب تشریف نہیں لائے۔ میرے استفسار پر مجھے بتایا گیا کہ ان کے والد صاحب کا پیغام آیا تھا' اس لیے وہ اچانک بہاول نگر چلے گئے ہیں۔ گویا میری مخدوش حالت کی بنا پر یہ الم ناک خبر مجھ سے پوشیدہ رکھی گئی۔ چند روز بعد مجھے شاہ صاحب کی علالت کی خود ساختہ خبر دی گئی اور بعد میں مجھے اصل حقیقت معلوم ہوئی کہ ہمارے مخدوم ۳۰ جنوری کی صبح کو، اسی وقار اور اطمینانِ قلب کے ساتھ، جو ان کا طرۂ امتیاز تھا، اپنے خالقِ حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔ شاہ صاحب کے صاحبزادے میاں احمد رضا شاہ صاحب کی ایک تحریر[۸] سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۹-۳۰ جنوری کی درمیانی شب شاہ صاحب اپنے معمولات سے فارغ ہو کر سو گئے۔ رات کو کسی وقت آپ کو سانس لینے میں دقت محسوس ہوئی[۹]۔ خدا جانے کتنی دیر تک انھوں نے اس تکلیف کو برداشت کیا۔ پھر حافظ حسن

عباس کو بلوا کر بتایا۔ انھوں نے شہر لے جا کر ڈاکٹر کو دکھانا چاہا لیکن نہیں مانے۔ کچھ دیر بعد افاقہ محسوس ہوا تو نیند آ گئی۔ صبح بیدار ہو کر فجر کی نماز ادا کی۔ اینا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں اپنا وقتِ موعود آ لگنے کا یقین ہو گیا تھا۔ چنانچہ دن نکلے جب حافظ صاحب نے شہر چلنے پر اصرار کیا تو صاف انکار کر دیا اور فرمایا کہ ''میری میت واپس لانے میں تمھیں دِقت ہو گی۔'' پھر حافظ صاحب سے فرمائش کی کہ میری عمر کا حساب لگاؤ۔ انھوں نے تعمیلِ ارشاد کے بعد عرض کیا کہ ستر سال تین ماہ اور بائیس روز بنتے ہیں۔ اس پر کہنے لگے۔ ''بس میری عمر آج تک کی لکھ لو۔'' پھر حافظ صاحب کو ہدایت کی کہ فلاں فلاں بستیوں میں میری وفات کا اعلان کروا دینا اور کسی کے انتظار میں میرا جنازہ دیر تک نہ رکھنا۔ اپنی بیگمات اور دیگر افرادِ خانہ سے گفتگو کرتے رہے۔ سب سے بڑے صاحبزادے شبیر احمد شاہ صاحب کے ساتھ کچھ دِنوں سے ناراض تھے اور مخاطب نہیں ہوتے تھے۔ انھیں طلب کر کے ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے ''یہ آخری ہاتھ ہے۔'' اس تمام عرصے میں تندرست آدمیوں کی طرح چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ حافظ صاحب نے کپڑے تبدیل کرنے کی درخواست کی۔ ان کا خیال تھا کہ شاید شہر جانے پر راضی ہو جائیں۔ اصرار کرنے پر کپڑے تبدیل کیے اور قبلہ رُو ہو کر کلمے کی تکرار کرنے لگے۔ اب لمحہء وصال آ پہنچا تھا۔ یکبارگی دونوں ہاتھوں کی انگشت ہائے شہادت آسمان کی طرف اٹھائیں اور جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جان دیگر ست

شاہ صاحب بلا شبہ اللہ کے ان مقبول بندوں میں سے تھے جن کے بارے میں حضرت مجدد الف ثانی اپنے ایک مکتوب[1] میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

''وہ ایسی جماعت ہے کہ ان کے ساتھ بیٹھنے والا کبھی بد بخت نہیں ہوتا۔ ان کا

دوست کبھی محروم نہیں ہوتا اور ان سے ضرورت طلب کرنے والا کبھی ناکام نہیں ہوتا---ان کو دیکھنے سے اللہ تعالیٰ یاد آجاتا ہے---ان کی نظر دوا ہوتی ہے، ان کا کلام شفا ہوتا ہے اور ان کی صحبت روشنی اور رونق ہوتی ہے۔''

میں ایک عرصے تک صاحبِ فراش رہا اور شاہ صاحب کے چہلم میں بھی شرکت نہ کرسکا۔ اس کے بعد مدنی صاحب برابر مجھے بہاول نگر چلنے کے لیے کہتے رہے لیکن جب میں سوچتا کہ اب وہاں جانے پر اس محبت بھری ہستی کی شفقت نصیب نہ ہوگی تو جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ مئی ۱۹۹۴ء میں مدنی صاحب کا تبادلہ شیخوپورہ سے چشتیاں ہوگیا اور پھر وہ بہاول نگر کالج میں پہنچ گئے۔ یہاں سے بھی ان کا تقاضا جاری رہا۔ میں نے بھی سوچا زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ شاہ صاحب سے کیا ہوا وعدہ پورا کر ہی آؤں۔ آج ہم یہاں ان کی یاد تازہ کرنے اور انھیں خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ اگرچہ وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اس اجتماع کو دیکھ کر ان کی روحِ پُرفتوح نہایت مسرور و شادکام ہوگی۔

حواشی

(۱) اُن دنوں میں بھی حقہ کا عادی تھا۔ میرے باقی تینوں ساتھی اس نعمت سے محروم تھے۔ مجھے اس کا یہ فائدہ ہوا کہ شاہ صاحب کے خصوصی التفات کا مورد قرار پایا۔

(۲) حاجی غلام مجتبیٰ شاہ صاحب کے نانا جو اپنے وقت کے پہنچے ہوئے بزرگ اور داد و دہش میں معروف تھے۔

(۳) اتفاق سے میری پیدائش ۹-اکتوبر ۱۹۳۵ء کی ہے۔ گویا ہم دونوں کا مشترکہ برج میزان ہے۔ کیا شاہ صاحب کی مجھ پر خصوصی عنایات میں اس برج کے اثرات بھی کارفرما تھے؟

(۴) غالباً ان صاحب کا نام محمد علی لالیکا تھا اور یہ موجودہ دور کے سیاسی رہنما عبدالستار لالیکا کے دادا اللہ بخش لالیکا کے چھوٹے بھائی تھے۔

(۵) اس کا سبب یہ تھا کہ شاہ صاحب کی والدہ جوئیہ قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ انہیں خدشہ تھا کہ میری وفات کے بعد میرے میکے والوں کا سادات کے اس خاندان سے تعلق منقطع ہو جائے گا۔ گویا یہ رشتہ انہوں نے اس تعلق کو قائم رکھنے اور مزید مضبوط کرنے کے خیال سے تجویز کیا تھا۔

(۶) شیرانی آباد میں ہمارا قبیلہ بھی تونسہ شریف والوں کے حلقۂ ارادت میں داخل تھا۔ وہاں ان کو سنگھڑ والے پیر کہا جاتا تھا۔ سنگھڑ وہ نالہ ہے جس کے کنارے تونسہ شریف واقع ہے۔

(۷) ملحوظ خاطر رہے کہ حضرت نور محمد مہارویؒ حضرت شاہ سلیمان تونسوی علیہ الرحمۃ کے مرشد تھے۔

(۸) ان معلومات کے لیے میں محترم احمد رضا شاہ صاحب کا ممنون ہوں۔

(۹) دراصل یہ دل کے دورے ہی کی ایک شکل تھی۔ شاہ صاحب ذیابیطس کے مریض تھے۔ اس مرض کے حامل کو دل کا دورہ پڑنے پر درد محسوس نہیں ہوتا۔

(۱۰) ''منتخب مکتوبات حضرت امام ربانی'' (مکتوب ۵۲، باب چہارم)، شائع کردہ محمڈن بک ڈپو، کشمیری بازار، لاہور۔

بے نام

اُنیس سو چھیاسٹھ یا سڑسٹھ کی بات ہے، میں شیخوپورہ میں بحیثیت کرایہ دار کھوکھر محلے والے مکان میں رہتا تھا۔ دیوار بیچ میرے کالج تاش پروفیسر عبدالرؤف قریشی بھی کرائے کے مکان میں مقیم تھے۔ ہمارا زیادہ وقت ساتھ گزرتا تھا۔ کالج بھی اکٹھے جاتے اور واپس آتے۔ دوپہر کا کھانا اکثر ساتھ ہی کھاتے یعنی دونوں گھروں کا ماحضر یک جا کرلیا جاتا۔ اس طرح اور کچھ نہیں تو تنوع ضرور ہو جاتا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ تنوع زندگی میں کتنی اہمیت رکھتا ہے۔

رؤف صاحب بڑے مخلص اور محبت والے آدمی تھے۔ اپنے مضمون کے ماہر اور فرائضِ منصبی ادا کرنے میں مستعد لیکن دوسرے تمام دنیوی معاملات میں نہایت سیدھے بلکہ سادہ لوح واقع ہوئے تھے۔ ان کے بھولپن سے نت نئے لطیفے جنم لیتے جو دوستوں کے تفننِ طبع کا سبب بنتے۔ اسی سادگی کے باعث مجھ جیسا ہیچ کارہ بھی ان پر اپنی دانائی کا رعب جما لیتا تھا۔ دنیا کا ہر شخص کسی نہ کسی معاملے میں خود کو دوسروں سے برتر محسوس کرتا اور اس مصنوعی سہارے سے زندگی کے کٹھن سفر کو اپنے لیے خوشگوار بنا لیتا ہے:

اگر نہ ہو یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

جاڑوں کی رُت تھی اور جمعرات کا دن۔ ہم دونوں کالج سے آکر حسبِ معمول کھانا کھا رہے تھے کہ گلی میں کسی سائل کی صدا بلند ہوئی۔ وہ بڑی پاٹ دار آواز میں کسی

مناجات کے شعر پڑھ رہا تھا۔ جو مصرع میرے کان میں پڑا یہ تھا:

ذات بے پروا ہے مولا ، تجھ کو پروا ہی نہیں

مصرع میں عظمتِ خداوندی اور عجزِ انسانی کے اعتراف کے ساتھ لہجے میں شکوہ وشکایت کا جو رنگ تھا، سائل کی گمبھیر اور دردناک آواز نے اسے دو آتشہ کر دیا تھا۔ اس غیر معمولی اور پُر اسراری صدا نے مجھے چند لمحوں کے لیے ساکت کر دیا۔ جو لقمہ ہاتھ میں تھا منہ تک نہ جا سکا۔ پھر فوراً ہی اس تاثر پر میرے جذبۂ نمود نے غلبہ پالیا اور میں نے رؤف صاحب سے مخاطب ہو کر کہا: ''یہ شخص ہندوستان کی کسی مسلمان ریاست سے تعلق رکھتا ہے۔'' رؤف صاحب شاید میری روز روز ان پر رعب جھاڑنے کی عادت سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ اچھل کر کھڑے ہوئے اور بغیر کچھ کہے تیزی سے باہر نکل گئے۔ میں ان کے اس ردِعمل کے لیے آمادہ نہ تھا تاہم ان کا منشا سمجھ گیا اور اپنی بات غلط نکلنے کے خدشے سے، دروازے میں کھڑا ہو کر باہر جھانکنے لگا۔ قریب ہی گلی کے نکڑ پر رؤف صاحب نے فقیر کو جالیا۔ جیب سے ایک روپیہ نکال کر اسے دیا اور بڑے اضطرار کے ساتھ پوچھا: ''بابا جی! آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟'' ''رام پور کا'' فقیر کا مختصر سا جواب میں نے بھی سن لیا تھا۔ رؤف صاحب کا میری دانائی کی چھتری سے نکلنے کا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا۔ وہ کچھ شرمندہ سے واپس آئے۔ میں ایک فاتحانہ بے نیازی کے ساتھ اپنی جگہ بیٹھ چکا تھا۔ انھوں نے آتے ہی پوچھا: ''یار تمھیں کیسے پتہ چلا؟''

''آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں علم القیاس وقیافہ میں بھی درک رکھتا ہوں'' میں نے لاف زنی کی۔

اگلی جمعرات کی صبح میں کالج جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ وہ انوکھی اور کرب ناک آواز پھر کان میں پڑی۔ آج وہ پند وموعظت پر مبنی کچھ ابیات پڑھ رہا تھا:

جب وہ پوچھے گا سرِ محشر بُلا کے سامنے
کیا جوابِ جرم دیں گے ہم خدا کے سامنے

اس صدا میں گندھی ہوئی مایوسی کا تاثر دل ہلائے دیتا تھا جیسے کوئی بے قرار روح فریاد کر رہی ہو، جیسے کسی جواری کی آخری پونجی لٹ چکی ہو۔ میں بے اختیار باہر نکلا اور کچھ پیسے اس کے ہاتھ پر رکھے۔ ساتھ ہی اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ کپڑے معمولی مگر صاف ستھرے، قمیض پر کالے رنگ کی پرانی صدری، نیچے چوخانے دار تہ بند، پاؤں میں خستہ گرگابی، سر پر دوپٹے کا پھینٹا، ہاتھ میں چھڑی، سانولی رنگت، چہرے پر بچپن میں نکلی ہوئی چیچک کے مدھم نشانات۔ نظر خاصی کمزور معلوم ہوتی تھی۔ میرا دل چاہا، اس کو بیٹھک میں بٹھا کر اس سے باتیں کروں۔ اس کی آپ بیتی سنوں۔ کسی مفکر کا قول ہے کہ دنیا میں تمھیں جتنے آدمی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں ان میں سے ہر ایک، ایک کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب یہ تمھارا کام ہے کہ کسی کتاب کا مطالعہ کرو یا اس کے مندرجات سے محروم رہو۔ ممکن ہے یہ مقولہ سب لوگوں پر صادق نہ آتا ہو مگر اس فقیر پر ضرور چسپاں ہوتا تھا۔ تاہم میرے شرمیلے پن کی عادت آڑے آئی۔ چنانچہ ذہن نے کالج جانے میں تاخیر کو بہانہ بنایا اور میں خاموشی سے گھر میں داخل ہوگیا۔ کچھ دیر بعد کالج جاتے ہوئے دور سے اس کی آواز سنائی دی:

یا الٰہی مَیں تو مجرم ہوں مگر تُو یہ بتا
کیا خطا کچھ چیز ہے تیری عطا کے سامنے؟

اب یہ دستور سا ہو گیا' وہ ہر جمعرات کی صبح پھیرا لگاتا اور میں کچھ پیسے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ ہر بار اس سے کچھ پوچھنے کو جی چاہتا مگر یہ خواہش زبان تک نہ آنے پاتی۔ ہاں جب تک اس کی آواز صاف سنائی دیتی میرے کان اسی کی طرف لگے رہتے اور میں کوئی کام نہ کرسکتا تھا۔ کچھ عرصے بعد مجھے احساس ہوا کہ اس کی آواز میں بعض

خصوصیات ہونے کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہے جو اس کی ادائیگی کو اتنا متاثر کن بنا دیتی ہے۔ پہلے تو میں نے اسے تلفظ کی صحت پر محمول کیا لیکن اس سے میری تسلی نہ ہوئی۔ اتفاق سے میں تھوڑا سا کلاسیکی موسیقی کا گن رسیا بھی ہوں۔ اس پہلو سے غور کیا تو اصل حقیقت کا انکشاف ہوا۔ وہ ہر نظم کو کسی نہ کسی راگ کی آروہی امروہی میں چست کر کے استھائی انترے کی صحت کے ساتھ پڑھتا تھا اور ساتھ ساتھ وقت کی مناسبت بھی ملحوظ رکھتا تھا۔

چھ سات ماہ بعد ایک دن میں کسی کام سے طارق روڈ جانے کا اتفاق ہوا۔ سکوٹر پر طارق روڈ کے قبرستان کے پاس سے گزر رہا تھا کہ قبرستان کے کونے پر ایک جھونپڑی نظر آئی۔ جھونپڑی کے باہر وہ بیٹھا ہوا تھا۔ ''اچھا تو یہ یہاں رہتا ہے!'' میں نے دل میں کہا ''کسی دن یہاں آ کر اس سے باتیں کرنا مناسب ہوگا۔'' چند ماہ گزرے ہوں گے کہ اس نے جمعرات کا پھیرا لگانا چھوڑ دیا۔ میں ہر جمعرات کی صبح اس کی راہ دیکھتا لیکن اسے آنا تھا نہ آیا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ اس کی خیر خبر لینے جاؤں گا۔ یہاں ہے بھی یا کسی اور شہر چلا گیا؟ کہیں بیمار نہ ہو گیا ہو؟ مگر مختلف مصروفیات میں یہ بات فراموش ہو جاتی۔

انھی دنوں میں نے کرائے کے مکانوں سے تنگ آ کر اپنے ایک عرصہ قبل خریدے ہوئے پلاٹ پر تعمیر کا ڈول ڈالا۔ یہ جگہ طارق روڈ سے زیادہ دور نہ تھی۔ میں سوچا کرتا کہ ذرا اس مکان کے کام سے فرصت ملے تو اس کی خبر گیری کو ضرور جاؤں گا۔ تعمیر کا کام توقع سے زیادہ طویل ہو گیا۔ اس میں میری ناتجربہ کاری اور بندۂ مزدور کی عیاری کے علاوہ عمارتی سامان کی فراہمی کا بھی دخل تھا۔ کبھی اینٹیں وقت پر نہ پہنچتیں کبھی سیمنٹ بازار سے غائب ہو جاتا۔ اس تگ و دو نے مجھے بے طرح تھکا دیا تھا۔ ابھی تکمیل کے آخری مراحل طے نہیں ہوئے تھے کہ مکان کے لیے مختص رقم کے علاوہ قرض

ادھار کے آسان ذرائع بھی ختم ہو گئے۔ ناچار کام بند کرنا پڑا اور میں اسی ادھورے مکان میں منتقل ہو گیا۔

کچھ دن تھکن اتارنے میں لگے۔ ایک دن عصر کے وقت طارق روڈ پہنچا۔ وہ بدستور سر جھکائے جھونپڑی کے باہر بیٹھا تھا۔ میں جی کڑا کر کے اس کے پاس گیا اور سلام کیا۔ اس نے بغیر سر اٹھائے سلام کا جواب دیا۔ مجھے احساس ہوا کہ اس کی بینائی ختم ہو چکی ہے۔ ''آپ عرصے سے نظر نہیں آئے؟'' میں نے پوچھا۔

''اندھا ہو گیا ہوں۔ یہیں بیٹھا رہتا ہوں۔ کوئی کچھ دے جاتا ہے تو ......''

''آپ نے علاج نہیں کرایا؟''

''کس سے کراتا؟ خود ہی الم غلم ڈالتا رہا ہوں۔ بالکل پٹ ہو گئی ہیں۔''

''اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں کسی ڈاکٹر کو دکھا دوں؟''

''جیسی آپ کی مرضی۔ ویسے اب دکھانے کا کوئی فائدہ تو ہے نہیں۔''

''کھانے کا کیا کرتے ہیں؟''

''اگر روٹی نہ ملے تو خود ہی ہاتھ پاؤں جلاتا ہوں۔''

میں نے دیکھا دیوار کے ساتھ اینٹیں رکھ کر چولھا بنایا ہوا تھا۔ اینٹوں پر جمی ہوئی کالک اور چولھے میں راکھ کے ساتھ کچھ ادھ جلی لکڑیاں اس کے بیان کی تصدیق کر رہی تھیں۔ میں نے سوچا اب میں قریب ہی تو رہتا ہوں۔ صبح شام اس معذور آدمی کو کھانا پہنچایا جا سکتا ہے۔ ''مگر یہ پابندی کس سے برداشت ہو گی؟'' ذہن کے کسی گوشے سے احتجاج بلند ہوا۔ ''روزی رساں خدائے بزرگ و برتر ہے۔ تم اس کے مکلف نہیں ہو'' ایک اور آواز نے سرزنش کی۔

''اچھا میں کل اسی وقت آؤں گا۔ آپ یہیں رہیے گا۔ ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔''

''میں بھلا کہاں جاسکتا ہوں؟''

میں نے کچھ پیسے اس کی مٹھی میں دیے اور سلام کر کے چلا آیا۔

اگلے روز سکوٹر لے کر پہنچا۔جھونپڑی کے قریب سکوٹر کھڑا کیا۔سامنے کی دکانوں والے مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگے۔میں نے دھیان دوسری طرف کر لیا۔ڈر تھا کہ کوئی کچھ پوچھ ہی نہ بیٹھے۔آج وہ ایک جھلنگا سی چارپائی پر بیٹھا تھا۔میں نے پاس جا کر کہا:''آیئے چلیں۔''وہ اٹھ کھڑا ہوا۔میں اس کا ہاتھ پکڑ کر سکوٹر تک لایا،سہارا دے کر سوار کیا۔اس کے پاؤں دونوں طرف پائیدان پر ٹکائے اور سیدھا ڈاکٹر یوسف قریشی ماہر امراض چشم کے مطب پہنچا۔ان سے پرانی شناسائی تھی۔اتفاق سے فارغ مل گئے۔میں نے کہا:''ڈاکٹر صاحب!ذرا ان بزرگوار کی آنکھوں کا معائنہ کیجیے۔''اُن روایتی دیووں (Cyclopes) کی طرح جن کے ماتھے پر ایک ہی آنکھ ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب پیشانی پر معائنے کی مشعل جما کر اٹھ کھڑے ہوئے۔مجھے بہت مایوسی ہوئی جب انھوں نے دونوں آنکھوں پر ایک نظر ڈال کر کہا:''اب کچھ نہیں ہوسکتا۔''

واپسی کے وقت اس نے صرف اتنا کہا:''میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا۔''لیکن میں راستے بھر خیالوں میں کھویا رہا۔اس شخص نے اپنی سابقہ زندگی میں نجانے کیا کیا عیش کیے ہوں گے اور کیسی کیسی محفلیں دیکھی ہوں گی۔اب اگر اس کی بینائی لوٹ بھی آتی تو اس کے دیکھنے کو رہ کیا گیا ہے؟اور مجھے غنی کشمیری کا شعر یاد آیا:

بس کہ آزردہ ام از دیدنِ مردم ، چہ عجب
مردمِ دیدہ اگر از نظرم افتاد ست

پھر میرا دھیان اپنے گاؤں کی ایک لڑکی کی طرف گیا جس کی آنکھیں چھوٹی سی عمر میں بصارت سے عاری ہوگئی تھیں۔بڑی ہوئی تو اس کا رنگ روپ دیکھ کر ہر شخص قدرت کی ستم ظریفی پر جی مسوس کے رہ جاتا۔پھر اس کی شادی ایک ایسے شخص سے

کردی گئی جو نابینا ہونے کے علاوہ انتہائی کم رو اور سیاہ فام تھا۔ایک بار گاؤں میں ماہرینِ امراضِ چشم کا رضا کار گروپ آیا۔ دونوں کی آنکھوں کا معائنہ کر کے رائے دی کہ شوہر کی تو نہیں لیکن بیوی کی نظر آپریشن سے ٹھیک ہوسکتی ہے۔لڑکی کی ماں نے فیصلہ کرنے کے لیے ایک دن کی مہلت لی۔ساری رات سوچتی رہی۔بیٹی کی معذوری دور ہونے سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوسکتی تھی لیکن جب یہ خیال آتا کہ نظر درست ہونے کے بعد جب وہ آئینہ دیکھے گی اور اپنے شوہر کی شکل بھی تو ضرور پوچھے گی کہ ''ماں! بے شک میں اندھی تھی لیکن تم تو آنکھوں والی تھیں؟''اور پھر صبح اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ''ڈاکٹر صاحب! ہمیں آپریشن نہیں کرانا۔''

اب مَیں دوسرے چوتھے' غروب بعد کے ملگجے میں کھانے کی کوئی چیز لے کر اس کے پاس جانے لگا۔بس صاحب سلامت ہوتی اور میں کھانا دے کر چپ چاپ چلا آتا۔نہ مجھے کبھی پوچھنے کی ہمت ہوئی نہ اس نے کچھ بتانے کی ضرورت محسوس کی۔میں ہر ماہ تنخواہ ملنے پر ایک قلیل سی رقم باقاعدہ اسے دینے لگا۔ایک کمی مجھے ضرور محسوس ہوتی' وہ یہ کہ اب میں اس کے پُرکار انداز اور دردناک آواز میں پڑھی جانے والی نظموں سے محروم ہوگیا تھا۔

عبدالرؤف قریشی صاحب کا تبادلہ ملتان ہو چکا تھا البتہ میرے کالج کے ایک اور ساتھی پروفیسر شاہد مرزا کو کسی طرح میری اس مصروفیت کی بھنک پڑ گئی۔چنانچہ وہ بھی ہفتے عشرے میں کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز اسے پہنچانے لگے۔ایک دن کہنے لگے:''یار وہ تمھارا فقیر عجیب آدمی ہے۔''

''کیوں کیا ہوا؟''میں نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔مرزا صاحب نے واقعہ سنایا۔وہ گئے روز، دن ڈھلے زردہ لے کر اس کے پاس پہنچے اور کہا:''بابا! چاول لے لو۔''وہ پوچھنے لگا''کیا ہے؟''

''چاول ہیں اور کیا ہے۔''

''بھئی چاول تو ہیں مگر ہے کیا؟''

اب مرزا صاحب کا ناریل چٹخ گیا۔شاید سامنے کے دکان داروں کی نظریں ان کا بھی تعاقب کر رہی تھیں۔جھلا کر بولے: ''زہر ہے۔'' اس پر وہ نرم پڑ گیا۔

''سمجھے نہیں! میرا مطلب تھا کہ چاول تو ہیں مگر سفیدہ ہے، قبولی ہے، طاہری ہے، چلاؤ ہے، پلاؤ ہے، زردہ ہے، بریانی ہے، مزعفر ہے، متنجن ہے، آخر ہے کیا؟'' یہ سن کر مرزا صاحب بھی دھیمے پڑے اور کہا ''زردہ ہے۔''

''تو یوں کہو'' وہ بولا اور اپنے برتن میں زردہ الٹتے ہوئے بے اختیار سا ہو کر کہنے لگا: ''میں نے اپنی جوانی میں دسیوں اقسام کا زردہ کھایا اور پھر اسے فضلے میں بدل دیا۔''

مرزا صاحب کی زبانی یہ واقعہ اور بالخصوص اس کا آخری فقرہ سن کر مجھے خیال آیا کہ اس شخص کا یہ سادہ سا اظہارِ حقیقت غالب کی اس غزلِ مسلسل کے مضمون سے کتنا ہم آہنگ ہے:

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل — زنہار اگر تمھیں ہوسِ ناؤ نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساتھ ہی میرا شبہ یقین میں بدل گیا کہ اس شخص نے ضرور بہت اچھے دن دیکھے ہیں اور اب زمانے کی بے مہریوں اور دنیا کی صعوبتوں کا شکار ہو کر ناداری اور کسمپرسی کا مرقع بنا بیٹھا ہے۔چنانچہ اس کے ماضی کو کریدنے کی خواہش میرے دل میں پہلے سے سوا ہو گئی۔

ایک دن سخت گرمی کے موسم میں مہینے کی پہلی تاریخ کو مغرب سے پہلے میں اس کی جھونپڑی پر پہنچا تو اندر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔میں نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔آواز آئی: ''کون ہے؟''

میں اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ بس اتنا کہا: ''میں ہوں۔''

جواب ملا: ''اچھا۔'' ذرا دیر بعد دروازہ کھلا: ''اندر آجاؤ۔''

میں نے چھوٹتے ہی پوچھا: ''آپ اس سخت گرمی میں دروازہ بند کر کے بیٹھے ہیں!''

''بارش نہیں ہو رہی نا، باہر بیٹھتا ہوں تو محلے کے شریر لڑکے مجھ پر پانی پھینکتے ہیں۔''

مجھے یہ سن کر بڑا دکھ ہوا۔ خاموش کھڑا تھا کہ وہ بولا: ''بیٹھ جاؤ۔''

میں نے چارپائی کی طرف نظر ڈالی۔ اس پر بستر بچھا ہوا تھا۔ میں نے ایک لمحہ توقف کیا۔ بستر صاف ستھرا تھا۔ میں پائینتی ٹک گیا۔ وہ بھی ٹٹول کر سرہانے کی طرف آلتی پالتی مار کر آرام سے بیٹھ گیا جیسے آج وہ کچھ کہنا چاہتا ہو۔ ذرا دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر اس کی آواز گونجی: ''رحمت بن کر آئے ہو نا! ایک نعت سناتا ہوں۔'' خدا جانے اسے کیسے پتہ چل گیا کہ میں اس کی آواز کو ترس رہا ہوں اور پھر وہی گمبھیر، لوچ دار اور کرب و یاس میں ڈوبی ہوئی آواز بلند ہوئی:

کھنچا کچھ اِس نرالی شان سے نقشا محمدؐ کا
کہ نقاشِ ازل خود ہو گیا شیدا محمدؐ کا

نجانے اس نے کتنے شعر پڑھے اور کتنی دیر تک پڑھے، میں مبہوت ہو چکا تھا۔ وقت کی نبض رک سی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں کسی اور دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ جب اس نے نعت ختم کی تو میں اس سحر زدہ کیفیت سے نکلا۔ اب کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہ تھی۔ میں اس سے رخصت ہو کر گھر کی طرف چل دیا۔ راستے میں میں نے مصمم ارادہ کیا۔ اب جس دن اس کے پاس آؤں گا اس کے ماضی کا قصہ ضرور چھیڑوں

گا۔اسی طرح اس کے پاس اطمینان سے بیٹھ کر کرید کرید کر سوال پوچھوں گا۔نہ معلوم کیسے کیسے انکشاف ہوں گے۔اس سے کچھ میرے اشتیاق ہی کی تسکین نہیں ہوگی ،اپنا دکھڑا سنا کر اس کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہوجائے گا۔میں بھی کتنا عجیب آدمی ہوں۔اتنا عرصہ گزر گیا اور میں اس کا نام بھی نہ جان سکا۔غرض اسی اُدھیڑ بُن میں گھر پہنچ گیا۔

اگلے دن کالج گیا تو دوستوں کو خوش گپیوں میں مصروف پایا۔معلوم ہوا کہ تفریحی الاؤنس کی چٹھی آ گئی ہے۔چند دن بعد موسم گرما کی تعطیلات شروع ہونے والی تھیں۔اہلِ خانہ پہاڑ پر جانے کا تقاضا کر رہے تھے۔میں نے تفریحی الاؤنس وصول کیا اور چھٹیاں ہوتے ہی ہم لوگ سوات روانہ ہو گئے۔وہاں بڑا اچھا وقت گزرا۔دو ہفتے گزرتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔واپس آکر دوستوں کو سیر کی تفصیلات سناتے اور وہاں کے قدرتی مناظر کی تصویریں دیکھتے دکھاتے اگلے مہینے کی پہلی تاریخ آ گئی۔تنخواہ لے کر گھر پہنچا تو اس کا تیا پانچہ کرتے وقت مجھے اس کی یاد آئی۔میں نے سوچا دنیا کے دھندے تو چلتے ہی رہتے ہیں، مجھے اس کے درماہے میں اضافہ کر دینا چاہیے۔بے چارہ کس اذیت کے دن کاٹ رہا ہے۔خدا کسی کا بڑھاپا یوں خوار نہ کرے۔

تیسرے پہر طارق روڈ پہنچا تو میرے تعجب کی انتہا نہ رہی۔وہاں جھونپڑی کا نام ونشان تک نہ تھا۔یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ آخر ہمت کر کے سامنے کی دکانوں پر گیا۔ایک بھلا سا آدمی دیکھ کر دریافت کیا۔"یہ بابا کہاں گیا؟"

"آپ کو نہیں پتہ؟ اسے تو مرے ایک مہینہ ہونے کو آیا۔"

"مگر ہوا کیا تھا؟"

"ہونا کیا تھا؟ فقیر تھا۔آگے پیچھے کوئی تھا نہیں۔ایک دن صبح سے شام تک دروازہ بند رہا۔شام کو کسی نے روٹی دینے کے لیے دروازہ کھٹکھٹایا تو جواب ندارد۔ہمیں

شک پڑا۔ دروازے کی بساط ہی کیا تھی، توڑ کر دیکھا تو بستر میں مرا پڑا تھا۔ رات ہی کو دفنا دیا اور کیا جی؟ رات بھر اس کے پاس کون بیٹھتا؟"

"اور وہ جھونپڑی کیا ہوئی؟" میں نے اگلا سوال کیا۔

"محلے کے کچھ لوگ جھونپڑی اور اس کے آگے کی جگہ پر قبضہ جمانے کی فکر میں تھے۔ دنگے فساد تک نوبت پہنچی۔ آخر کچھ بھلے مانسوں نے بیچ میں پڑ کر فیصلہ کیا کہ یہ رقبہ قبرستان کا ہے۔ اس پر کوئی بھی قابض نہ ہو۔ چنانچہ جھونپڑی صاف کر کے جگہ قبرستان میں شامل کر دی گئی۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہوتے اِدھر اُدھر سے کچھ لوگ ہمارے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ان کی نگاہوں سے شک جھانک رہا تھا۔ شاید وہ مجھے بھی اس جگہ کے طلب گاروں میں سے ایک سمجھ رہے تھے۔ میں ان کی نظروں کی تاب نہ لا سکا اور وہاں سے کھسک جانا ہی مناسب سمجھا۔ اس کی قبر کا نشان بھی نہ پوچھ سکا کہ دعا کے لیے ہاتھ ہی اٹھا لیتا۔ گھر آتے ہوئے غالب کی اسی غزل کا آخری شعر میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا:

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

شبیرا

وسط جولائی ۱۹۶۵ء کی کوئی تاریخ تھی۔ میں گرمی کی چھٹیوں میں لاڑکانہ گیا ہوا تھا اور اپنے سسرال میں مقیم تھا۔ دوپہر کے وقت کسی ضرورت سے باہر نکلا۔ مغرب کی سمت کچھ فاصلے پر ریلوے سٹیشن تھا۔ اُن دنوں سٹیشن سے مسافروں کے نکلنے کا راستہ دوسری طرف تھا اور مشرقی جانب وہ پھاٹک جس سے مال گاڑی پر چڑھنے اترنے والا سامان گزرتا تھا' اس پھاٹک سے ایک دیوار، جو ریلوے کی اراضی اور پٹڑی کی حد بندی کرتی تھی، شمالی سمت پرانی سٹیشن روڈ تک چلی گئی تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ ایک کچی سڑک تھی۔ گرمی کی شدت کے پیشِ نظر میں نے اسی مختصر راستے سے سٹیشن روڈ جانے کا ارادہ کیا۔ کچے راستے کے آغاز ہی میں میرے بائیں ہاتھ ایک چھپر کے نیچے تندور تھا جسے روٹیاں پکوانے والے بچے گھیرے کھڑے تھے۔ دائیں جانب تندور کے بالمقابل ایک خام کوٹھڑی تھی جس کے آگے چٹائی بچھائے چار مخنث بڑی سنجیدگی سے تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ ابھی میں کچھ دور ہی تھا کہ بھٹیاری کی ہانک میرے کان میں پڑی: ''اے شبیرے! تندور کی موری بند کردے۔'' (تندور جب پوری طرح گرم ہو جاتا ہے تو اس کا تاؤ دیر تک قائم رکھنے کے لئے ہوا فراہم کرنے والی موری بند کردی جاتی ہے)۔ ان چاروں میں جو بھی شبیرا تھا اس نے تاش میں انہماک کے باعث سنی ان سنی کردی۔ میں ذرا قریب پہنچا تو بھٹیاری نے دوسری ہانک لگائی لیکن اس کا بھی شبیرے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میرے بالکل نزدیک پہنچتے پہنچتے تیسری ہانک پڑی جس کے نتیجے میں

تیس ایک برس کی عمر کا ایک شخص اٹھا۔ اٹھتے ہوئے اس نے ناک بھوں چڑھا کر ہاتھ کے پتے زور سے چٹائی پر اوندھے مارے اور میرے آگے سے سڑک پار کرتے ہوئے جھنجھلا کر بڑبڑایا۔ ''ایک تو ہر وقت ان کی موری بند کرتے رہو۔'' میں خاموشی سے آگے بڑھ گیا لیکن اس کی جھنجھلاہٹ اور چست کردہ فقرے نے مجھے بڑا محظوظ کیا۔

میرے مرحوم خسر، جن کو ہم سب ''بھائی صاحب'' کہتے تھے اور ان کے ایک بھائی دو ملحقہ مکانوں میں رہتے تھے۔ ماشاء اللہ ایک پانچ اور دوسرے کے چھ بیٹے تھے۔ رات دس بجے کے بعد جب بزرگ سو جاتے تو دو تین گھنٹے کے لئے ہماری محفل جمتی۔ اُس رات جب نوجوانوں کی منڈلی جمی تو میں نے دوپہر والا واقعہ بیان کیا۔ اس پر ان میں سے دو تین بیک وقت بول اٹھے: ''ارے! آپ شبیرے کو نہیں جانتے؟ وہ تو کبھی کبھی خیر خیریت معلوم کرنے یہاں بھی آتا رہتا ہے۔ پچھلے سال آپ کی شادی پر کئی دن یہیں مصروف رہا۔'' معلوم ہوا کہ شبیرا لڑکپن میں اُس گھر کے باورچی خانے میں کام کیا کرتا تھا اور ان لڑکوں میں سے بعض کو اس نے گودوں میں کھلایا ہے۔ میری خوشدامن روایتی مشرقی کھانے بڑے لذیذ پکاتی تھیں۔ شبیرے نے ان سے یہ ہنر سیکھا اور اب کسی سیٹھ کے ہاں کھانا پکانے پر ملازم تھا۔

چند روز بعد عصر کے وقت میں اپنے کمرے میں نیم دراز کسی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ ایک بچے نے آ کر کہا: ''آپ کو نیچے مردانے میں یاد کر رہے ہیں۔ شبیرا آیا ہے۔'' میں پہنچا تو دیکھا کہ لڑکے شبیرے کو گھیرے بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھ کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بڑی اپنائیت سے ملا اور مودب ہو کر بیٹھ گیا۔ دو چار رسمی باتیں ہوئیں۔ اب میں نے اسے غور سے دیکھا۔ سیاہ فام، موٹے اور کھردرے نین نقش، سُتا ہوا چہرہ جس پر رخساروں کی ہڈیاں نمایاں تھیں، دبلا پتلا، متوسط قامت، سر پر پٹے جنھیں سمیٹ کر اوپر رومال بندھا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ لڑکے جب اسے باتوں سے زیر

کرنے میں ناکام ہو جاتے تو دست درازی پر اتر آتے تھے جس سے وہ بہت گھبراتا تھا۔میری موجودگی میں بھی دوایک نے اس سے چھیڑ چھاڑ کی کوشش کی۔وہ چپکے چپکے آنکھیں دکھاتا رہا۔ایک بار تنگ آکر بول اٹھا:''ارے نیک بختو! کچھ تو ان کا خیال کرو۔تمھارے بڑے ہیں۔باادب بانصیب بے ادب بے نصیب۔'' کچھ دیر بیٹھ کر بولا۔''اچھا اب میں چلتا ہوں۔سیٹھانی انتظار کر رہی ہوگی۔رات کا کھانا تیار کرنا ہے۔''

شبیرا گھر پر تو کبھی کبھار ہی آتا لیکن دکانوں کے آگے سے گزرتے ہوئے اگر جلدی میں نہ ہوتا تو ٹھیکی لے لیتا تھا۔میرے نسبتی عزیزوں کا مختلف نوع کا کاروبار تھا یعنی چمڑا،شو میٹریل، کپڑا اور جنرل مرچنٹ وغیرہ۔باقی دکانیں تو مغرب تک بند ہو جاتیں لیکن موخرالذکر، جو گھر سے زیادہ دور نہ تھی،رات نو بجے تک کھلی رہتی۔عصر کے بعد دکان کے آگے مونڈھے رکھ دیئے جاتے۔بھائی صاحب دن ڈھلے وہاں آجاتے اور میل ملاقاتی بھی وہیں پہنچ جاتے۔حالاتِ حاضرہ اور ماضی کے واقعات زیر بحث رہتے۔گفتگو متنوع اور دلچسپ ہوتی تھی اس لئے میں بھی اکثر شام کو ان مجالس میں شامل ہوتا۔۱۹۶۵ء کی جنگ کے باعث میں ستمبر تک لاڑکانہ میں مقیم رہا۔اس اثناء میں شبیرے سے دوچار اتفاقی ملاقاتیں ہوئیں۔میں اسے ابتدائی تاثر والے رنگ میں دیکھنا چاہتا تھا لیکن وہ بھائی صاحب کی طرح میرا بھی احترام کرتا تھا۔اگر کہیں بیٹھا چہک رہا ہوتا تو مجھے دیکھتے ہی خاموش ہو جاتا۔میرا سال میں دوبار لاڑکانہ کا چکر لگتا تھا۔دسمبر کی تعطیلات میں مختصر اور گرمی کی چھٹیوں میں طویل۔یوں آئندہ برسوں میں مجھ پر شبیرے کے مختلف خصائل وخصائص آشکار ہوتے چلے گئے۔

میرے ساتھ مودبانہ رویے کے باعث میرا اس سے مذاق کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا تاہم دوسروں کے ساتھ نوک جھونک میں وہ جس حاضر جوابی کا مظاہرہ کرتا اس کا لطف اٹھانے کے لئے مجھے ایسے لوگوں کی جستجو رہتی تھی جو اس کے ساتھ لفظی جنگ

کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ رشتے کے لحاظ سے میرے ایک ہم زلف ہیں ذاکر علی خان صاحب۔ قائم گنج کے پٹھان، بڑی نستعلیق گفتگو کرنے والے اور دوران گفتگو اشاروں کنایوں سے کام لینے والے۔ باریش، باشرع، حوصلہ ایسا کہ خود اپنا مذاق اڑانے سے بھی نہیں چوکتے۔ شبیرے کو دیکھتے ہی ان کی زبان میں کھجلی ہونے لگتی تھی۔ ادھر انھوں نے کوئی فقرہ کسا اور اُدھر سے ترنت جواب ملا۔ پہلے تو مبارزانہ انداز میں لڑائی ہوتی اور پھر جنگ مغلوبہ تک نوبت پہنچتی۔ ایمان کی بات ہے کہ مقابلے میں پلّا ہمیشہ شبیرے کا بھاری رہتا۔ ذاکر بھائی اس کے تیکھے الفاظ نظر انداز کرتے ہوئے اپنی چوٹیں جاری رکھتے۔ شبیرا بھی اپنی الفیل ومالفیل سے نہیں چوکتا تھا یہاں تک کہ ان کی ڈاڑھی پر پھبتیاں کستا اور عباداتؔ پر طنز کرتا۔

ایک بار گھر میں کوئی تقریب تھی۔ شبیرا سیٹھ صاحب کے ہاں سے چھٹی لے کر آ گیا تھا اور صبح سے کام میں جتا ہوا تھا۔ جب سب لوگ کھانا کھا چکے تو کہیں عصر کے وقت شبیرے کی باری آئی۔ وہ گلی میں ایک چارپائی پر بیٹھا کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ بہت سے لوگ ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ مجھے دور سے ذاکر علی خان صاحب آتے دکھائی دیے۔ انھیں کسی وجہ سے دیر ہوگئی تھی۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور خاصا آگے بڑھ کر چپکے سے کہا: ''اس وقت شبیرے کا دھیان کھانے کی طرف ہے۔ دو دو چونچیں ہو جائیں۔'' یہ کہہ کر میں ان سے الگ ہوگیا۔ وہ زیرلب مسکراتے ہوئے آگے بڑھے۔ اب خدا جانے شبیرے نے مجھے ان سے بات کرتے دیکھ کر معاملہ بھانپ لیا یا اس نے اس مقولے پر عمل کیا کہ حملے میں پہل کرنا بہترین دفاع ہے، بہرحال اس سے قبل کہ خان صاحب قریب پہنچیں اور کچھ کہیں اس نے دور سے ہی انھیں کھانے کی صلا دی: ''اے ذاکر بھائی! مزے والی بوٹی کھا لو۔'' ذاکر صاحب نے بغیر ایک لفظ کہے رخ بدل لیا اور گھر میں داخل ہوگئے۔ میں لپک کر ان کے پاس پہنچا اور گلہ کرتے ہوئے کہا ''آج تو

آپ نے بڑا مایوس کیا۔'' کہنے لگے: ''بھائی ان سے کون پورا اتر سکتا ہے؟''

ایک عرصے بعد ۱۹۷۷ء میں جب بھٹو حکومت کے خلاف پاکستان قومی اتحاد کی تحریک چل رہی تھی تو لاڑکانہ میں ذاکر علی خان بھی اپنی جماعت کی طرف سے اس میں سرگرم حصہ لے رہے تھے۔ان دنوں اتفاق سے ان کا شبیرے سے سامنا ہو گیا۔وہ عجلت میں تھے اس لئے کسی قسم کی بحث سے دامن بچا کر چل دیے۔شبیرے نے پکار کر کہا: ''کان کھول کر سن لو، تمھاری حکومت نہیں آنے کی۔زیادہ اکڑفوں دکھاؤ گے تو ٹوپی والے آجائیں گے، ہاں!'' اور واقعی کچھ دن بعد ضیاء الحق نے اقتدار پر قبضہ جما لیا۔

ایک اتوار کی صبح میں صحن میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔لڑکے بالے تعطیل کے سبب مردانے میں جمع تھے۔شبیرا باہر والے دروازے سے مردانے میں داخل ہوا۔لڑکوں نے اسے دیکھ کر شور مچایا لیکن اس نے ڈانٹ کر سب کو خاموش کر دیا۔میں نے اندر جانا مناسب نہ سمجھا اور بدستور اخبار دیکھتا رہا۔کچھ دیر بعد میں نے کان لگائے تو شبیرا بزرگانہ انداز میں بچوں کو نصیحتیں کر رہا تھا۔ایسی نصیحتیں جو ماں باپ اپنی اولاد کو کیا کرتے ہیں۔یہ میرے لئے اس کے کردار کا ایک نیا پہلو تھا۔

فارسی کا ایک مشہور شعر ہے جو کہاوت کا درجہ حاصل کر چکا ہے:

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

حقیقت یہ ہے کہ اس کلیے کا اطلاق عورت اور مرد کے علاوہ تیسری جنس پر بھی ہوتا ہے۔یہ طبقہ بالعموم لالچی، بزدل، انتظامی صلاحیتوں سے بے بہرہ اور روحانی معاملات سے ناواقف سمجھا جاتا ہے لیکن اگر ہم تاریخ کے صفحات پر نظر دوڑائیں تو خواجہ سراؤں کے ادارے میں ایسے ایسے کردار ملتے ہیں جو ان کے بارے میں عمومی تصورات کی بالکل نفی کر دیتے ہیں۔اسی حقیقت کے پیش نظر نظیر اکبر آبادی نے کہا تھا:

یوں دیکھنے میں گرچہ یہ ہلکے سے مال ہیں　　ناچیں ہیں، نیگ جوگ کا کرتے سوال ہیں
ہم کو تو پر انھوں سے ادب کے خیال ہیں　　اکثر انھوں کے بھیس میں صاحب کمال ہیں
جو کچھ مراد مانگو وہ برلاویں ہیجڑے

شبیرا بھی ہر چند کہ اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا لیکن مستثنیات میں سے تھا۔ ناچنے گانے سے، جو ان لوگوں کا اصل پیشہ سمجھا جاتا ہے، اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس نے ہمیشہ ملازمت کے ذریعے روزی کمائی۔ تالی شاذونادر ہی بجاتا۔ تھرکنا اور مٹکنا جو اس پیشے کی خاص نشانی ہے وہ اس سے بالکل عاری تھا۔ البتہ باتیں کرتے ہوئے کبھی کبھی دائیں ہاتھ سے ایک مخصوص اشارہ کر دیتا۔ علاوہ ازیں لہجے میں ہلکی سی لٹک تھی۔ یہ دونوں باتیں اس کی گفتگو کو زیادہ دلچسپ بنا دیتی تھیں۔ گالی گلوچ اس نے کبھی نہیں کی۔ جب کوئی حماقت دیکھتا یا کسی ظلم و زیادتی کا ذکر ہوتا تو اپنے ردعمل کا اظہار اس فقرے سے کرتا ''ہت تیرے مر جائیں۔'' لالچ اس کے پاس بھی نہ پھٹکا تھا۔ میں نے کبھی نہیں سنا کہ اس نے کسی سے کچھ طلب کیا ہو۔ کھانے پینے کا شوق اسے نہ تھا۔ خلوص و وفا اور وضعداری کی صفات جو اس دور میں کمیاب ہیں اس میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ہمدردی اور انسان دوستی میں بھی اس کا پایہ بہت بلند تھا۔ عائلی معاملات سے بھلا اسے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی لیکن ایسے مناقشات پر وہ جس بصیرت سے روشنی ڈالتا، نتائج اخذ کرتا اور حکم لگاتا اس سے بڑا اچنبھا ہوتا۔ ایسے مسائل بالعموم اسی موڑ یا منزل پر پہنچتے جس کی نشان دہی وہ پہلے سے کر چکا ہوتا تھا۔ جن سیٹھ صاحب کے ہاں ملازم تھا وہ اپنا کاروبار سمیٹ کر کسی بڑے شہر میں منتقل ہونے لگے۔ شبیرے کو ساتھ لے جانے کی بڑی کوشش کی پر وہ مان کر ہی نہ دیا۔ اسے بے روزگار ہونا منظور تھا لیکن لاڑکانہ چھوڑنا کسی قیمت پر گوارا نہ تھا۔

اس واقعے کے بعد جب میں لاڑکانہ پہنچا تو مجھے شبیرے کی بے روزگاری کا پتہ چلا۔ دوسرے دن وہ ملنے آیا تو اس سے اظہار ہمدردی کیا۔ بڑے اطمینان سے

بولا: ''کوئی بات نہیں۔ اللہ کوئی سبب بنا دے گا۔ یوں تو کئی لوگوں نے ملازمت کی پیشکش کی ہے۔ کل ہی ایک صاحب آئے تھے۔ معاملہ پٹ گیا تھا مگر وہ کہنے لگے: پلنگ کی چائے دینی پڑے گی۔ میں نے کہا: ''پلنگ کی چائے تو میں نہیں دوں۔'' بیڈ ٹی کے اس دلچسپ ترجمے کے علاوہ آخری جملہ بولتے ہوئے اس نے اپنے چہرے سے جس خوف کا اظہار کیا اور ساتھ ہی دائیں ہاتھ سے نہ ماننے کا جو اشارہ کیا اس سے مجھے بڑا لطف آیا۔ دراصل وہ رات دیر سے سونے کا عادی تھا اور صبح سویرے اٹھنے سے کتراتا تھا۔ پھر ایسا اتفاق ہوا کہ جلد ہی اسے ایک طرح کی سرکاری ملازمت مل گئی یعنی وہ سیشن جج لاڑکانہ کا مستقل باورچی مقرر ہو گیا۔ اس کام پر وہ آخر تک متعین رہا۔''

چند سال بعد ایک بار میں نے اس سے پوچھا ''سیشن جج تو مختلف قسم اور مزاج کے آتے رہتے ہیں، تمھیں اس ضمن میں دقت تو ہوتی ہو گی؟'' کہنے لگا ''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ سندھی ججوں کا پسندیدہ کھانا تو بھت ہوتا ہے۔ یہ مل جائے تو وہ خوش اُن کا خدا خوش۔ ہاں مہاجروں کے نخرے ہوتے ہیں۔ کئی طرح کا سالن، چاول، کباب، چٹنی پھٹنی، اچار پچار مگر پنجابی کھانا سب سے اچھا۔ (یہ سن کر مجھے ایک گونہ مسرت ہوئی)-----سادہ-----چھولے ہی چھولے۔'' آخری الفاظ سن کر مجھ پر اوس سی پڑ گئی اور حاضرین نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ مجھے شرمندہ محسوس کر کے اس نے صراحت کی ''میں آپ سے مذاق نہیں کر رہا۔ یہ حقیقت ہے۔ موجودہ جج صاحب سے پہلے ایک لاہور کے صاحب تھے۔ ان کا ایک دو ڈھائی سال کا بچہ مجھ سے ایسا ہلا کہ صبح سے لے کر رات تک میری جان نہیں چھوڑتا تھا۔ وزنی بھی بہت تھا۔ سارا دن اٹھائے اٹھائے میری کمر ٹوٹ جاتی تھی۔ اتفاق سے صاحب کے قریبی عزیزوں میں کوئی شادی تھی۔ انھیں ایک ہفتے کے لئے لاہور جانا تھا۔ بیگم صاحب کہنے لگیں: شبیرے! تو بھی ساتھ چل، یہ بچہ تیرے بغیر نہیں رہے گا۔ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات' جانا

پڑا۔ شادی کی تقریبات کے بعد کسی عزیز کے ہاں دعوت تھی۔ رنگ رنگ کے پر تکلف کھانے موجود تھے۔ ہمارے صاحب کی بیگم نے دستر خوان کا جائزہ لیا اور خاتون خانہ سے شکوے کے انداز میں مخاطب ہوئیں "ائے آپاں جی! اک تساں بڑا ظلم کیتا!" وہ بیچاری ہکّا بکّا ہو کر" دیکھنے لگی کہ میں نے اس پر کون سا ظلم کر دیا ہے۔ ذرا وقفہ دے کر بیگم صاحبہ نے فرمایا "چھولے نہیں پکائے۔" ہت تیرے مر جائیں، یہاں بھی چھولے ڈھونڈھ رہی ہے۔"

میرے سب سے بڑے برادرِ نسبتی عمر میں مجھ سے خاصے چھوٹے تھے۔ میں ان کا احترام کرتا تھا کیونکہ میری اہلیہ ان کی پیٹھ کی تھیں۔ ان کی پرورش بڑے ناز و نعم سے لیکن کڑی نگرانی میں ہوئی تھی۔ بھائی صاحب اولاد کو سونے کا نوالہ کھلانے اور شیر کی نظر سے دیکھنے کے قائل تھے۔ اس کا ردِعمل یہ ہوا کہ موصوف کا مزاج گھڑی میں اولیاء گھڑی میں بھوت قسم کا ہو گیا۔ تھے بھی جوانِ رعنا۔ ہم انھیں "بھائی" کے لفظ سے مخاطب کرتے تھے۔ ان کی شادی بہاولپور میں ٹھہری۔ ہم لوگ لاڑکانہ سے برات لے کر گئے۔ شادی ہوتے ہی ان کا وہ حال ہوا کہ بقول شاعر:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

کاروبار پر دھیان دینا تو کجا، ایک گھر میں رہتے ہوئے باپ صورت دیکھنے کو ترس گیا۔ پہلے تو بھائی صاحب ضبط کرتے رہے، آخر جب تین ہفتے ہونے کو آئے تو انھیں تشویش ہوئی۔ بردبار آدمی تھے۔ میرے سامنے گھر میں تو کوئی بات نہیں ہوئی لیکن ایک دن شام کو میں حسبِ معمول دکان پر پہنچا تو بھائی صاحب مونڈھے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ رخ دوسری طرف تھا اس لئے انھوں نے مجھے آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کے سامنے شبیرا کھڑا تھا۔ میرے کانوں میں یہ جملے پڑے: "شبیرے! تو ہی اس ......کو کچھ سمجھا۔ یارو شادیاں سب کی ہوتی ہیں مگر یہ حال کسی کا نہیں دیکھا۔ اگر مجھے یہ خبر ہوتی

کہ یہ ایسا.....بھوت نکلے گا تو کبھی اس کی شادی نہ کرتا......'''' بھائی'' کے آگے شبیرے کے بھی پَر جلتے تھے۔ پھر بھی اس نے بڑی سعادت مندی سے کہا'' اچھا بھائی صاحب ! میں کوشش کروں گا۔'' اور اجازت لے کر چل دیا۔

اگلے ہفتے بھائی کی دلھن بہاولپور گئیں۔ دوسرے روز قیلولے کے وقت وہ میرے کمرے میں آئے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں، پھر میری آنکھ لگ گئی۔ جب میں جاگا تو کان میں شبیرے کی دھیمی سی آواز آئی۔ میں نے بدستور آنکھیں بند رکھیں۔ وہ ''بھائی'' کو سمجھا رہا تھا۔ ماں باپ کے حقوق، بھائی بہنوں میں بڑے ہونے کے اعتبار سے ان کے فرائض، کاروبار پر توجہ دینے کی ضرورت اور تمام معاملات میں توازن اور اعتدال ملحوظ رکھنے کی اہمیت زیر بحث موضوعات تھے۔ بیچ بیچ میں جب ''بھائی'' اپنی عادت کے مطابق گرم ہو جاتے تو شبیرا انھیں ٹوکتا: '' آہستہ بولو۔ دولھا بھائی سو رہے ہیں۔ ان کی نیند میں خلل پڑے گا۔'' جس چیز سے میں زیادہ متاثر ہوا وہ اس کا اس خاندان کی خیر خواہی کا جذبہ جو اس کی بات بات سے مترشح تھا یا اس کا لجاجت بھرا لہجہ اور سلیس بامحاورہ زبان۔ جتنی دیر یہ گفتگو جاری رہی میں دم سادھے بڑا لطف اندوز ہوتا رہا۔ شبیرے کے جانے کے بعد ہی میں نے آنکھیں کھولیں۔

شبیرا گفتگو میں ایسی ایسی کہاوتیں اور ضرب الامثال استعمال کرتا تھا جو اب صرف اردو کی اچھی لغاتوں اور فرہنگوں میں دیکھی جا سکتی ہیں اور بعض تو وہاں بھی نہیں ملتیں۔ علاوہ ازیں اس میں الفاظ کی ایجاد کا مادہ بھی تھا۔ ان بہت سی دلچسپ اصطلاحات میں سے جو اس نے ادائے مطالب کے لئے گھڑ رکھی تھیں' چند مجھے یاد ہیں' مثلاً چوزہ (نوعمر اور ناسمجھ)' کھڑ پیل (پکی عمر کا اور چالاک)' شیش ناگ (گرگِ باراں دیدہ)' گہلوٹیا (احمق، خبطی)' گدر گھسیڑا (دردر پھرنے والا بے وقعت شخص) وغیرہ۔

سیشن ججی میں ملازمت ملنے کے بعد شبیرے کو معاشی اعتبار سے اطمینان

نصیب ہوا۔ معقول تنخواہ تھی اور پھر جج صاحب کے ہاں آنے والے ملاقاتی اور مہمان بھی حق الخدمت کے طور پر اسے کچھ نہ کچھ دے جاتے تھے۔ اس کا معمول تھا کہ صبح ناشتے سے نمٹ کر سودا سلف لانے کے لیے چھلّی پکڑ کر جیلس مارکیٹ جانے کے لئے نکلتا۔ راستے میں کپڑے والی دکان پڑتی تھی' وہاں رک جاتا۔ اس وقت دکان پر لڑکوں کا راج ہوتا تھا چنانچہ شبیرے کو گھیر لیا جاتا' تلاشی لی جاتی' ٹوکری اور پیسے چھن جاتے اور مطالبہ ہوتا کہ پہلے کچھ کھلاؤ تب جانے دیں گے۔ وہ لاکھ کہتا کہ "یہ پیسے تو سودے کے ہیں میرے اپنے نہیں' میں بیگم صاحب کو کیا جواب دوں گا" مگر وہاں کون سنتا تھا۔ اس چھینا جھپٹی کا اپنا ہی لطف ہوتا۔ خاصی دیر تک پریشان کرنے کے بعد گلوخلاصی ہوتی اور چائے وغیرہ پلا کر رخصت کیا جاتا۔ بعض اوقات از خود جیب سے پیسے نکال کر اصرار کرتا کہ ان کی کوئی چیز منگوا لو۔ لڑکے انکار کرتے تو روہانسا ہو جاتا۔ آخر اس کا دل رکھنے کے لئے کچھ منگوایا جاتا۔ لطف یہ ہے کہ اگر کسی دن لڑکے جان بوجھ کر اس پر توجہ نہ دیتے تو اسے فکر لاحق ہو جاتی کہ شاید یہ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ پھر اس کی منت سماجت دیکھنے والی ہوتی تھی۔ دراصل یہ سارا کھیل دلی لگاؤ اور تعلقِ خاطر تھا ورنہ نہ تو ان بچوں کو کسی چیز کی احتیاج تھی اور نہ شبیرے پر وہاں آنے کی کوئی مجبوری۔

تنہائی کا دکھ بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ شبیرے کا اصل روگ بھی یہی تھا۔ اپنے ہم جنسوں اور ان کے مشاغل سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ شروع شروع میں وہ فرصت کا وقت گزارنے کے لیے تاش کھیلنے ان کے پاس جا بیٹھتا تھا لیکن اب عرصے سے یہ سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان بچوں ہی کو جو اس کے سامنے بلکہ اس کے ہاتھوں میں بڑے ہوئے تھے' اپنا سمجھتا تھا۔ بالخصوص عزیزی نثار کو جس کی عرفیت "بابو" تھی بہت عزیز رکھتا تھا۔ پیار سے اسے "بَبّو" کہتا۔ ایک دن موج میں آ کر کہنے لگا "میرے مرنے کے بعد بَبّو میری درود فاتحہ کرے گا۔" اب اس کی توجہ مذہب کی طرف بھی ہو چلی

تھی۔ مجھے خود بتایا کہ ''اب میں جلدی سو جاتا ہوں اور پچھلی رات کو اٹھ کر اللہ اللہ کرتا ہوں۔'' دو ایک بار حج پر جانے کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔

سنہ ۱۹۷۳ء کے لسانی فسادات نے ربع صدی کی اس جمی جمائی محفل کو درہم برہم کر دیا۔ ہندوستان کے طول وعرض سے ترکِ وطن کر کے آئے ہوئے لوگوں نے حالات کے پیش نظر کراچی اور حیدرآباد کا راستہ لیا۔ اس خاندان کے بزرگوں نے بھی کراچی منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ کچھ جائیدادیں اونے پونے فروخت کیں لیکن پھر لڑکے اَڑ گئے۔ ایک ''بھائی'' کے علاوہ وہ سب لاڑکانہ کی پیداوار تھے۔ یہیں پلے بڑھے' یہاں کے سکولوں کالجوں میں تعلیم حاصل کی' سندھی مادری زبان کی طرح بولتے تھے۔ آخر یہ طے پایا کہ کچھ نوجوان بزرگوں کے ساتھ کراچی جائیں اور کاروبار کا ڈول ڈالیں۔ صرف چند لڑکے' جن میں بابو بھی شامل تھا' لاڑکانہ کے معاملات سنبھالیں۔

ان نئے حالات میں بھی شبیرا بدستور اپنی وضع پر قائم رہا۔ وہ اس گھر کی خوشی میں خوش اور دکھ میں دکھی تھا۔ اس کی سب سے بڑی فکر' کہ یہ سب لوگ لاڑکانہ سے چلے جائیں گے' اب دور ہو چکی تھی۔ وہ ایک عرصے سے اپنا اندوختہ بابو کے پاس رکھتا آیا تھا۔ حالات کے مدنظر بابو نے بینک میں اس کے نام کا اکاؤنٹ کھلوا دیا۔ فارم بھرتے وقت وارث کے خانے میں اس نے بڑے اصرار سے بابو کا نام لکھوایا۔ غالباً اس کا ارادہ پیسے جمع کر کے حج کرنے کا تھا لیکن کئی برس بعد جب کھاتے میں مناسب رقم جمع ہو گئی تو بابو کے کہنے پر اس نے ریلوے اسٹیشن کے مغرب میں ایک مختصر سا مکان خرید لیا۔ رات کو کام سے فارغ ہو کر وہاں آجاتا تھا۔

سنہ ۱۹۹۰ء میں اہل خانہ کی ایک اور قسط کراچی چلی گئی تو کھانا پکانے کا سوال پیدا ہوا۔ کسی دیانت دار آدمی کی تلاش تھی جس کو مکان کی چابیاں سپرد کی جاسکیں۔ جب کوئی موزوں شخص نہ ملا تو شبیرے نے خود اس کام کا بیڑا اٹھا لیا۔ اپنی ملازمت کے تقاضے

پورے کرنے کے ساتھ ساتھ یہ اضافی کام نمٹانا خاصا دشوار تھا اور اس کے لئے اسے اپنے آرام کے اوقات کی قربانی دینا پڑی۔ یہ ذمہ داری شبیرے نے دو چار ماہ نہیں' پورے سات برس تک نباہی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس طویل عرصے میں وہ زیادہ ہشاش بشاش رہا۔ یہ امر اس کی طمانیت کا باعث تھا کہ میں اپنے پیاروں کے کسی کام آ رہا ہوں۔

شبیرا بڑے دردمند دل کا مالک تھا اور اس کا مظاہرہ وہ اپنی بساط کے مطابق کرتا رہتا تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ایک بات جس کا محض اتفاق سے علم ہوا یہ تھی کہ ریلوے اسٹیشن کے نواح میں جھگیوں میں بسنے والے مفلوک الحال لوگوں کے ہاں جب کوئی موت ہوتی تو میّت کا کفن شبیرا دیا کرتا تھا۔ ۱۹۷۵ء کے ابتدائی دن تھے۔ چلّے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ شمال سے چلنے والی برفانی ہوا خون منجمد کیے دیتی تھی۔ شبیرا کام سے فارغ ہو کر پہر رات گئے گھر جا رہا تھا۔ اسٹیشن کے باہر اس نے ایک جوڑے کو دیکھا جو شاید محنت مزدوری کے لئے کسی گاؤں گوٹھ سے شہر آیا تھا۔ سر چھپانے کے لئے کوئی آسرا تھا نہیں۔ سردی سے بچاؤ کے لئے مناسب کپڑے بھی نہ تھے۔ شبیرے کو بڑا ترس آیا۔ ان کو اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ بڑا کمرہ ان کو رہنے کے لئے دے دیا اور اپنا مختصر سامان اٹھا کر چھوٹی کوٹھری میں لے گیا۔ رات کو جب واپس آتا ان کا حال احوال پوچھتا اور کوٹھری میں جا کر پڑا رہتا۔

سنہ ۱۹۷۷ء کے اواخر میں بابو کی شادی کراچی میں بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ شبیرے نے شادی میں بھرپور شرکت کی۔ وفورِ مسرت سے اس کا پاؤں زمین پر نہ پڑتا تھا۔ لاڑکانہ میں وسیع تعلقات کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا کہ ولیمے کی ایک دعوت وہاں بھی کی جائے۔ ۴ دسمبر کی شام کا وقت مقرر ہوا۔ شبیرا دو دن پہلے کراچی سے لاڑکانہ پہنچ گیا۔ گھر کو سجایا' بجلی کے قمقمے آویزاں کیے۔ ۳ دسمبر کی شام کو باقی سب آ پہنچے۔ شبیرا رات گئے تک مصروف رہا۔ گھر جانے سے پہلے بابو کے پاس آیا اور بولا: ''اللہ کا لاکھ

لاکھ شکر ہے کہ تمھارا گھر بس گیا۔ خدا تمھیں شاد آباد رکھے۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔ آج میں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوا۔'' یہ کہہ کر گھر کی چابیوں کا گچھا بابو کے آگے رکھ دیا اور تھکے تھکے قدموں سے رخصت ہو گیا۔

اگلے دن دعوت تھی۔ سب لوگ دن بھر دوڑ بھاگ میں مصروف رہے لیکن شبیرا نظر نہ آیا۔ کئی موقعوں پر اس کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ خیال یہ تھا کہ اتنے دن چھٹی پر رہا ہے۔ آج جج صاحب کے ہاں کام کر رہا ہوگا۔ شام تک آ جائے گا۔ مہمانوں کے جانے کے بعد سامان سمیٹتے آدھی رات ہو گئی۔ سب تھکے ہوئے تھے۔ گھوڑے بیچ کر سوئے۔ صبح اٹھتے ہی کسی کو شبیرے کی طرف دوڑایا۔ وہ خبر لایا کہ شبیرا بستر میں پڑا ہے۔ تیز بخار ہے۔ سنتے ہی بابو ڈاکٹر کو لے کر پہنچا۔ اس نے انجکشن اور دوا دی اور کہا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ تھکن سے بخار ہو گیا۔ اسے آرام کی ضرورت ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے کچھ کھلا پلا کر واپس آئے۔ شام کو گئے تو بخار اتر چکا تھا۔ ساتھ لانا چاہا تو بولا: ''کل کا دن آرام کر لوں۔ پرسوں جج صاحب کے ہاں حاضری دے کر آؤں گا۔'' ۶ دسمبر کو آرام کرنے سے اس کی طبیعت خاصی سنبھل گئی۔ سب مطمئن تھے لیکن ۷ دسمبر کو طلوعِ آفتاب سے ذرا پہلے شبیرے کے مکان میں رہنے والے شخص نے آ کر اطلاع دی کہ رات کسی وقت شبیرا اللہ کو پیارا ہو گیا۔ خبر ایسی غیر متوقع تھی کہ کسی کو یقین نہ آیا۔ جا کر دیکھا تو واقعی مینا اڑ چکی تھی اور پنجرہ خالی پڑا تھا۔ سخت صدمہ ہوا۔ تجہیز و تکفین کر کے ظہر کے بعد نماز جنازہ پڑھی گئی اور اسے سپردِ خاک کر دیا گیا۔

ہم کیوں نہ اپنے آپ کو رو لیویں جیتے جی   اے دوست کون پھر کرے ماتم فقیر کا

بابو نے قل خوانی، جمعراتوں کی فاتحہ اور چہلم کا باقاعدہ اہتمام کیا۔ چہلم کے بعد شبیرے کے اکاؤنٹ میں موجود رقم نکلوا کر ناداروں اور مستحقین میں تقسیم کر دی گئی۔ بابو کا ارادہ تھا کہ مرحوم کا مکان فروخت کر کے اس کی قیمت کسی یتیم خانے یا خیراتی

ادارے کو دے دی جائے لیکن اس بارے میں جب مکان میں رہنے والے شخص سے بات کی تو اس نے بتایا کہ یہ مکان تو شبیرے نے مجھے دے دیا تھا اور میرے پاس تحریر موجود ہے جس پر اس کا انگوٹھا لگا ہوا ہے۔ بات سمجھ میں آنے والی نہ تھی کیونکہ وہ مرحوم تو معمولی سے معمولی کام بھی بابو کی صلاح کے بغیر نہیں کرتا تھا۔

اس سلسلے میں قانونی ماہرین سے مشورہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ دیوانی کیس ہے جو طوالت کے باعث دادخواہوں کو دیوانہ کر دیتا ہے۔ اس طویل مدت میں ''دعویٰ جھوٹا قبضہ سچا'' کے مصداق قابض کو بالادستی حاصل رہے گی۔ کامیابی کا امکان اس صورت میں ہے کہ مدّعا علیہ کی مزعومہ تحریر پر لگے ہوئے انگوٹھے کا شبیرے کی ملازمت کے کاغذات میں ثبت نشانِ انگشت سے مقابلہ کر کے اسے مجعول ثابت کیا جا سکے لیکن یہ امکان بھی موجود تھا کہ اس شخص نے شبیرے کے مرنے کے بعد کسی پہلے سے تیار کردہ تحریر پر اس کا انگوٹھا لگا لیا ہو۔ اس صورت میں تمام محنت اکارت جائے گی۔ اسی سوچ بچار میں کئی ماہ گزر گئے۔

ایک دن محض اتفاق سے بابو کی ملاقات اُس غسّال سے ہو گئی جس نے شبیرے کو غسل دیا تھا۔ مرحوم کی اچانک موت کا ذکر درمیان میں آیا تو وہ کہنے لگا: ''جب میں اسے غسل دے رہا تھا تو اس کے گلے پر کچھ غیر معمولی نشانات نظر آئے تھے۔ میں نے نعش پر پانی ڈالنے والے شخص کی توجہ ان نشانات کی طرف دلائی تھی (یاد رہے کہ یہ وہی مکان میں رہنے والا شخص تھا) تاہم اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا جس پر میں خاموش ہو گیا۔'' اب معاملہ سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔ چنانچہ فوجداری کے وکلاء سے رجوع کیا گیا لیکن وہاں سے بھی کوئی ہمت افزا جواب نہ ملا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ تدفین کو ایک عرصہ ہو چکا تھا اور پوسٹ مارٹم کی صورت میں کوئی ثبوت فراہم ہونا ممکن نہ تھا۔ دوسرے موقع کا گواہ بھی کوئی نہ تھا۔ سارا مقدمہ ایک غسّال کی شہادت کے

کچے دھاگے سے متعلق ہوتا جو کسی وقت بھی ٹوٹ سکتا تھا۔

اب قانون کے دائرے سے باہر کی ایک صورت رہ جاتی تھی۔ وہ یہ کہ اپنے اثر ورسوخ کی بنا پر پولیس کی روایتی تفتیش کے ذریعے ملزم کو اقرارِ جرم پر آمادہ کیا جاتا لیکن اس ترکیب کے ذریعے اسے سزا ہونے کا ایک فیصد امکان بھی نہ تھا۔ الٹا یہ خدشہ تھا کہ شرپسند عناصر اس بات کو مقامی مہاجر مناقشت کا رنگ دے دیں گے۔ میرے خیال میں اس ساری صورتِ حال کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ جس طرح خوفِ فسادِ خلق سے بہت سی گفتنی باتیں ناگفتہ رہ جاتی ہیں اسی طرح خوفِ زبانِ خلق سے بھی بہت سے کرنے والے کام ناکردہ رہتے ہیں۔ یقیناً بابو کے ذہن میں یہ اندیشہ موجود ہوگا کہ اس محسن کش پر تشدد کروایا گیا تو شہر میں تھڑی تھڑی ہوگی۔ لوگ کہیں گے کہ دیکھو اس تمول کے باوجود ایک جھونپڑی کے حصول کی خاطر غریب آدمی پر ظلم کر رہے ہیں۔ بہرحال بات وہیں ختم ہوئی کہ

نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا　　یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

خدا جانے شبیرا کہاں کا رہنے والا تھا اور کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتا لاڑکانہ پہنچا تھا۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس نے ساری زندگی کسی کا دل نہیں دکھایا اور اس اعتبار سے وہ بجا طور پر ''بہشتی چڑیا'' کہلانے کا مستحق تھا۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ اگلے جہان میں جب فرشتے اس سے حساب کتاب لیں گے تو ایک بار تو وہ تنگ کران سے ضرور کہے گا: ''ہت تمھارے مر جائیں' دیا کیا تھا جس کا حساب مانگ رہے ہو۔''

جمعہ بھائی

۲۸-اکتوبر۲۰۰۳ء کو رات کے پونے دس بجے شیرانی آباد (ضلع ناگور، راجستھان) سے عزیزی عمر فاروق کا فون آیا، جس سے یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ بھائی جمعہ خان کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ سوچ کر کہ ایسی محبت کرنے والی ہستی اور باغ و بہار شخصیت سے اب اس عالمِ آب وگل میں ملاقات نہ ہو سکے گی، میرا دِل بھر آیا۔ رات سونے کے لیے لیٹا تو کتنی دیر تک گزشتہ ساٹھ برس کی یادیں تصویروں کی شکل میں ذہن کے پردے پر اُبھرتی ڈوبتی رہیں۔

جمعہ بھائی ہماری چھوٹی دادی جان کے حقیقی بھانجے اور پانچ بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ہم سب بہن بھائیوں کی تمام تر پرورش چھوٹی دادی جان کے ہاتھوں ہوئی تھی، اس لیے ہم ان کو نہ صرف ''ماں'' کہتے تھے بلکہ ماں سمجھتے بھی تھے۔ اِسی مناسبت سے اُن کی بہن کو خالہ' ان کے بہنوئی کو خالوجی اور ان کے بھانجوں کو بھائی کے الفاظ سے مخاطب کرتے تھے۔ جمعہ بھائی مجھ سے کوئی اٹھارہ بیس سال بڑے ہوں گے۔ اُنھوں نے بڑی سیلانی اور بے چین طبیعت پائی تھی۔ آزادی سے قبل دُور دُور کے سفر کرتے تھے، بلکہ یہ سلسلہ تقسیمِ ملک کے بعد بھی بڑی حد تک جاری رہا۔ ۱۹۴۰ء سے قبل دادا جان کے عرصۂ قیامِ لاہور میں یہاں بھی آتے رہتے تھے۔ دادا جان موسمِ گرما کی تعطیلات شیرانی آباد میں گزارتے تو وہاں ان کے شکار کے شغل اور پرانے کتبوں اور سکّوں کی جستجو میں جو نوجوان کارکن پیش پیش ہوتے، اُن میں جمعہ بھائی بھی شامل تھے۔

میں اُن دِنوں بہت چھوٹا تھا، اس لیے اس وقت کی کوئی یاد میرے نہاں خانۂ دِماغ میں موجود نہیں۔ البتہ ہمارے ٹونک چلے جانے کے بعد اُن کا وہاں آنا جانا خوب یاد ہے۔ اُن کے آنے سے ہمیں بہت خوشی ہوتی تھی، کیونکہ ایک تو وہ بڑوں میں بڑے اور بچوں میں بچے بن کر رہتے تھے۔ دوسرے سنجیدہ سے سنجیدہ بات میں ظرافت کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ہر بار ہفتہ عشرہ ٹھہرنے کے بعد جب جانے لگتے تو ہم بہن بھائی ان سے لپٹ جاتے اور رُکنے پر اصرار کرتے اور اکثر اوقات اُنھیں دو تین دِن مزید ٹھہرنے پر آمادہ کر لیتے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۸ء کے اوائل تک جاری رہا، جب ہم لوگ ٹونک سے ترکِ وطن کر کے لاڑکانہ آ گئے۔

۱۹۴۹ء کے موسمِ بہار کی ایک دوپہر کو دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے جمعہ بھائی کھڑے تھے۔ میں حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت میں اُن سے لپٹ گیا۔ دو ہفتے گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ پھر وہ میرے بہنوئی علی گوہر خاں شیرانی کے پاس عمرکوٹ چلے گئے جو سندھ کے ضلع تھرپارکر کا سرحدی قصبہ ہے۔ پھر بازدید کا یہ یک طرفہ سلسلہ کئی برس تک جاری رہا۔ اُن دِنوں حکومتِ ہند کی پالیسی کے مطابق مسلمانوں کے ہندوستان سے پاکستان آنے پر کوئی پابندی نہ تھی، لیکن واپس جانا ممکن نہ تھا۔ جمعہ بھائی یوں کرتے کہ ٹرین کے ذریعے کھوکھراپار کے راستے سے آتے۔ پہلے لاڑکانہ پہنچتے۔ کچھ روز قیام کے بعد عمرکوٹ چلے جاتے۔ وہاں سے ایک اونٹ خریدتے اور اس پر بیٹھ کر کسی رات سرحد پار کر جاتے۔ تیسرے روز وہ اپنے گھر پہنچ جاتے تھے، جس کی اطلاع ہمیں خط کے ذریعے مل جاتی تھی۔ اگلی بار آنے پر گزشتہ واپسی کے دلچسپ واقعات سناتے اور اپنی رنگ آمیزی اور نکتہ آفرینی سے صحرائی جہاز پر طے کردہ سفر کو سندباد جہازی کی داستان بنا دیتے۔

جنوب مشرقی سندھ کا صحرائی علاقہ جغرافیائی اعتبار سے مارواڑ کے ریگستان کا

حصہ ہے۔ یہاں ریت کے ٹیلوں میں سڑکوں اور راستوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رات کو سفر کرتے ہوئے ستاروں کی مدد سے سمت کا تعین کرنا ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ جمعہ بھائی حسب معمول اونٹ پر سرحد کی جانب رواں دواں تھے۔ سوءِ اتفاق سے آسمان پر بادل چھا گئے اور یہ بھٹک کر پاکستانی سرحدی پولیس کی ایک چوکی پر جا نکلے، مگر اوسان قائم رکھے۔ نام پتہ پوچھنے پر ایک نواحی پاکستانی گاؤں کا نام لیا۔ پولیس والوں نے بتایا کہ یہ گاؤں یہاں سے کوئی تین میل دُور اس سمت میں ہے۔ یہ بولے "گاؤں تو میں جیسے تیسے پہنچ جاؤں گا۔ اتنا بتا دو کہ ہندوستان کی سرحد کس طرف ہے، تاکہ اندھیرے میں اُدھر نہ نکل جاؤں۔" غرض ضروری معلومات حاصل کر کے بظاہر نشان دادہ گاؤں کی جانب روانہ ہو گئے اور کچھ دُور جا کر مطلوبہ سمت کا رُخ کر لیا۔ اس میں شک نہیں کہ جمعہ بھائی بڑے مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ حاضر دِماغی پر حاضر جوابی مستزاد تھی۔ ایسے شخص میں مہم جوئی کا مادّہ قدرتی طور پر ہوتا ہے جو اُن میں بھی موجود تھا۔

اُن دِنوں ہمارے ایک دُور کے عزیز مسعود صاحب سندھ میں مختارِ کار تھے۔ ڈگری، جھڈو، جیمس آباد وغیرہ تعلقوں میں متعین رہے۔ اُنھوں نے یہ پیشکش کی کہ اُن کے زیرِ انتظام علاقوں میں ہندوؤں کے کچھ متروکہ دیہات خالی پڑے ہیں۔ اگر شیرانی آباد والے سارے اعزّہ اُٹھ کر آ جائیں تو انھیں یہاں بخوبی بسایا جا سکتا ہے۔ علی گوہر خاں شیرانی کو یہ منصوبہ معقول معلوم ہوا۔ چنانچہ اُنہوں نے وہاں متعدد افراد کو خط لکھے۔ ان کے پیہم اصرار پر دو اشخاص تفحّصِ حال کے لیے روانہ کیے گئے۔ ایک جوان اور ایک بوڑھا۔ جوان تو جمعہ بھائی تھے اور بزرگ تھے ہمارے ایک رشتے کے پھوپھا احمد خاں شیرانی جن کی عمر اسّی برس سے کیا کم ہوگی۔ یہ دو رُکنی وفد پہلے تو لاڑکانہ آیا اور پھر چند ماہ عمر کوٹ میں مقیم رہا۔ ابھی یہ اِدھر ہی تھے کہ شیرانی آباد میں منعقد ہونے والے ایک جرگے کے اجلاس نے نقل مکانی کی اس تجویز کو یکسر مسترد کر دیا۔ ان کا استدلال یہ تھا

کہ ہم اپنی زمینیں اور مکانات وغیرہ کو تو چھوڑ سکتے ہیں لیکن بزرگوں کی ہڈیوں (یعنی گورستانوں) اور مساجد سے کسی قیمت پر دست کش نہیں ہو سکتے۔ اُدھر مسعود صاحب نے پاکستانی افسر شاہی کے لچھن دیکھ کر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور کراچی میں وکالت شروع کر دی۔

اب وفد کی واپسی کا مرحلہ درپیش تھا۔ بدقسمتی سے احمد خان کو بخار نے آ لیا جس سے وہ بالکل نڈھال ہو گئے۔ بہرحال جمعہ بھائی نے ایک اچھا سا اونٹ خریدا اور بڑے میاں کو پیچھے بٹھا کر بدقت تمام شیرانی آباد پہنچے۔ یہ اُن کی پاکستان میں آخری آمد تھی، کیونکہ جلد ہی اُن کے والد کا انتقال ہو گیا اور کنبے کی سربراہی کا بوجھ ان کے کندھوں پر آن پڑا۔

راجستھان کے جنوب میں مالوہ کا علاقہ زرخیزی میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی ریاست رتلام کے مرکزی شہر میں ایک محلہ شیرانی پورہ ہے، جہاں کے باشندے مغلوں کے دورِ عروج میں راجا رتن سنگھ کے ساتھ جا کر وہاں بس گئے تھے۔ ان کا اپنے سابقہ مرکز (حال شیرانی آباد) سے تعلق برابر قائم رہا۔ مالوہ کی خاص پیداوار افیون ہے جو یوں تو سرکاری نگرانی میں ادویہ ساز کمپنیاں خریدتی تھیں، لیکن چپکے چھپانے دوسرے علاقوں کو سمگل بھی ہوتی تھی۔ راجپوتانے کے ٹھاکر تو معجونِ فلک سیر کے شیدائی تھے۔ اُن کے ہاں مہمان کی تکریم کے لیے منوار کی جو رسم تھی، اس کے تحائف میں بھی افیون جزوِ لازم کی حیثیت رکھتی تھی۔ پھر سردی کے موسم میں شیر خوار بچوں اور سن رسیدہ بوڑھوں کو ٹھنڈ سے بچانے کے لیے اس کا استعمال عام تھا۔ اس افادیت کے باعث اسے احتراماً کالی ماتا کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ بہرحال ہوتا یہ تھا کہ شیرانی آباد سے جو فرد بھی کسی سلسلے میں شیرانی پورہ جاتا، واپسی پر دو چار تولے افیون جیب میں ڈال کر لے آتا۔ اتنی سی مقدار پر کوئی خاص روک ٹوک بھی نہ تھی۔

سچ پوچھیے تو سمگلنگ سے پٹھانوں کا شغف جانا مانا ہے۔اس حقیقت کا تجزیہ یہ ہے کہ پٹھان بڑی حریت پسند قوم ہے۔آزادیٔ کردار ان کے مزاج کا حصہ ہے۔حکومتوں کی طرف سے مختلف اشیاء کی آزادانہ نقل وحمل پر پابندی ان کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ اس معاملے میں قانون شکنی کو جرم نہیں عین صواب سمجھتے ہیں جس طرح نہری نظام سے قبل پنجاب میں مویشیوں کی چوری کو بہادری کے مترادف خیال کیا جاتا تھا۔ غرض یہ کہ سمگلنگ کی مصروفیت پٹھانوں کے ضمیر پر کوئی منفی اثر نہیں ڈالتی۔

کئی برس پہلے کی بات ہے۔ شاہ نبی کالام کے اُس وقت کے سب سے اونچے ہوٹل فلک سیر میں چیف کک کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ہم حسب معمول کالام پہنچے تو اس نے کئی بار ہمیں اپنے ہوٹل میں آنے کی دعوت دی۔ میں نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ کسی قسم کا تکلف نہیں کرے گا اور ہمیں صرف چائے کی پیالی پلائے گا۔ایک سہ پہر کو ہم تین چار دوست گل نبی (مرحوم) کے ساتھ فلک سیر ہوٹل پہنچے۔ ہوٹل کے پھاٹک پر چند لمبی لمبی کاریں کھڑی تھیں اور ان کے ڈرائیور خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ اندر داخل ہوئے تو صحن کے وسط میں ایک میز کے گرد چار معزز بزرگ تشریف فرما تھے۔ رنگ میدہ وشہاب، لمبی سفید نورانی ڈاڑھیاں، ماتھوں پر محرابیں، ہاتھوں میں تسبیحیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے چار مقدس فرشتے کسی اہم مشن پر ابھی ابھی اُتر کر آئے ہیں۔ میں ان کی شخصیتوں سے بڑا متاثر ہوا۔ ہم چمن کے ایک گوشے میں کرسیوں پر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے، لیکن میری توجہ اِسی طرف رہی۔ مغرب کا وقت ہوا تو ان لوگوں نے بڑے خشوع وخضوع سے باجماعت نماز ادا کی۔ وہ یقیناً کوئی غیر معمولی ہستیاں تھیں۔ آخر میں رہ نہ سکا۔ بڑے اشتیاق کے ساتھ گل نبی سے پوچھا ''یہ کون بزرگ ہیں؟'' گل نبی نے جواب دیا ''یہ وہ ہے--- وہ--- پوڈر والا۔'' (یاد رہے کہ سرحد کے عوام کی اصطلاح میں ''پوڈر'' ہیروئن کو کہا جاتا ہے)۔

اب تفصیلات کا تو مجھے علم نہیں پر اِتنا ضرور ہے کہ ۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیانی عرصے میں کسی وقت جمعہ بھائی مالوے سے افیون لانے کا آغاز کر چکے تھے۔ یہ سلسلہ اِسی طرح شروع ہوا جیسے شیر ابتدا میں محض حادثاتی طور پر کسی انسان کا شکار کر بیٹھتا ہے اور رفتہ رفتہ پورا آدم خور بن جاتا ہے۔ ہاں ایک بات یقینی ہے' اس نئی مصروفیت میں اُن کے لیے مالی منفعت کا پہلو اِتنی کشش نہیں رکھتا ہوگا جتنا سیر و سیاحت اور مہم جوئی کا عنصر۔ اپنے مزاج کی اُفتاد کے تقاضے سے اُنھوں نے اس کاروبار کو پُرخطر بنانے کے لیے ایک قدم آگے بڑھایا۔ راجستھان کے شمال میں مشرقی پنجاب کا صوبہ تھا جہاں کے متموّل سکھ زمیندار بھی چنیا بیگم کے رسیا تھے۔ قیمت بھی وہاں اچھی ملتی تھی۔ جمعہ بھائی اپنا مال پنجاب پہنچانے لگے۔

۱۹۶۱ء میں چند روز کے لیے میرا شیرانی آباد جانا ہوا۔ وہ اِسی گرم جوشی اور تپاک سے ملے۔ میں نے اُن میں کوئی تبدیلی محسوس نہ کی، سوائے اس کے کہ اُنھوں نے ڈاڑھی رکھ لی تھی۔ نمازی وہ شروع ہی سے تھے۔ تین سال کے وقفے سے اکتوبر ۱۹۶۴ء میں دوبارہ گیا تو جمعہ بھائی نظر نہ آئے۔ معلوم ہوا کہ وہ سنگرور (پنجاب) جیل میں ہیں۔ ناجائز افیون کے مقدمے میں ماخوذ ہوئے اور ڈیڑھ سال کی سزا ہوگئی۔ ایک ہفتے کے قیام میں مجھے ان کی کمی بہت محسوس ہوئی اور میں بوجھل دِل کے ساتھ واپس آیا۔ بعد میں خطوں سے پتہ چلا کہ وہ نو دس ماہ کی قید کاٹ کر رہا ہو گئے تھے۔

۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں کے نتیجے میں پاک و ہند کے تعلقات برسوں کشیدہ رہے۔ چنانچہ ایک طویل عرصے بعد ۱۹۸۱ء کے اواخر میں ٹونک اور شیرانی آباد جانے کا موقع ملا۔ اس بار میرے مواخاتی بھائی چودھری عبدالغنی (آف چک نمبر ۱۷) کا ولی عہد عزیزی عبدالقیوم بھی ساتھ تھا۔ گاؤں کی کایا ہی پلٹ چکی تھی۔ کاشت کے لیے ٹریکٹر اور پانی کی باقاعدہ فراہمی کے لیے ٹیوب ویل عام ہو چلے تھے۔ جمعہ بھائی نے

اپنا اضافی مشغلہ ترک کر کے زمین داری پر توجہ مرکوز کر دی تھی۔ ان کی ڈاڑھی سفید ہو چکی تھی، لیکن طبعی ظرافت اور زندہ دِلی بدستور قائم تھی۔ حالات و واقعات پر اُن کی رائے زنی کا بھی وہی عالم تھا اور اپنے خیالات کے بے لاگ اظہار کی وہی کیفیت۔ جتنے دِن ہمارا قیام رہا، وہ سارا دِن ہمارے پاس رہتے۔ ہم قرب و جوار میں مختلف عزیزوں سے ملنے اور گرد و نواح کے تاریخی آثار دیکھنے جاتے تو وہ بھی ہمارا ساتھ دیتے۔ یہ مجھ سے اُن کے تعلقِ خاطر کا عملی مظاہرہ تھا۔

شیرانی آباد کی مشمولہ چار بستیوں میں سے شمالی بستی ذرا بلندی پر واقع ہونے کی وجہ سے اونچا گاؤں کہلاتی تھی۔ یہاں دادا جان کے سب سے چھوٹے بہنوئی سراج الرحمٰن خاں مرحوم کی ضعیف ہمشیرہ رہتی تھیں۔ ایک دِن ہم جمعہ بھائی کے ہمراہ اُن کے ہاں سلام کو گئے۔ سراج الرحمٰن خاں کی اولاد میں سے اب صرف ان کے سب سے چھوٹے بیٹے جمیل الرحمٰن خاں (جے۔ آر۔ شیرانی) حیات تھے، جو محکمۂ جنگلات کے ایک بڑے افسر رہ چکے تھے اور اُن دِنوں حیدرآباد (سندھ) میں فراغت کی زندگی گزار رہے تھے۔ اثنائے گفتگو میں بڑی بی نے مجھے مخاطب کر کے بڑے اشتیاق سے کہا، ''جمیل سے کہنا کہ ایک بار وہ بھی آ کر مل جائے۔'' جواب میں میرا ''بہت اچھا'' کہنا کافی ہوتا، مگر جمعہ بھائی کہاں چوکنے والے تھے۔ فوراً بول اُٹھے۔ ''اگر دِل میں چاہ نہ ہو تو کسی کے کہنے سے کوئی نہیں آیا کرتا۔ یہ تو آپ کے بھتیجے کو خود سوچنا چاہیے۔ (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ آجاتے ہیں یا نہیں؟'' بڑی بی افسردہ سی ہو گئیں جس کا مجھے ملال ہوا، لیکن حقیقت وہی تھی جو جمعہ بھائی نے کہہ ڈالی۔

مجھ سے جمعہ بھائی کی بے پایاں محبت بھی اُن کی تنقیدی حس اور صاف گوئی کی راہ میں مزاحم نہیں ہوتی تھی۔ ایک دِن ہم لوگ مشہور تاریخی قصبے کھاٹو کے پرانے آثار دیکھنے گئے۔ پہاڑ کے دامن میں ایک شکستہ عمارت پر ایک پرانے کتبے کی باقیات تھیں۔

میں اس کٹی پھٹی عبارت کو پڑھ کر اپنی نوٹ بک میں درج کرنے لگا۔ دوسرے ساتھی ذرا دُور ٹھہر گئے۔ جب مجھے کتبہ پڑھنے میں دیر ہوئی تو عبدالقیوم نے جمعہ بھائی کو چھیڑا۔ ''آپ تو باباجی (حافظ محمود شیرانی) کے ساتھ بہت رہے ہیں۔ کیا وہ بھی پرانی تحریریں پڑھنے میں اِتنا وقت صرف کرتے تھے؟'' جواب میں جمعہ بھائی نے میری طرف اشارہ کر کے یوں رائے زنی کی: ''یہ کیا چیز ہیں! ایسے کتبے تو بابا پلک جھپکتے میں پڑھ لیا کرتے تھے۔'' اس بے لاگ اظہارِ حقیقت اور مجھ سے اُن کی بے پناہ محبت میں جو تضاد تھا، اس سے عبدالقیوم بڑا محظوظ ہوا اور بعد میں اس نے مزے لے لے کر یہ قصہ مجھے سنایا۔

میرا جی بہت چاہتا تھا کہ جمعہ بھائی اپنی سابقہ غیر قانونی سرگرمیوں، گرفتاری اور قید کے حالات اپنے مخصوص انداز میں سنائیں، لیکن اس موضوع پر اُن سے بات کرتے جھجکتا تھا۔ یہ مشکل مرحلہ بھی عبدالقیوم نے آسان کیا۔ دراصل وہ اُن کے چٹکلوں اور نکتہ آفرینیوں میں اِتنی دلچسپی لیتا تھا اور اتنا کرید کرید کر تفصیلات پوچھتا تھا کہ اس کے اشتیاق کی شدت کے پیشِ نظر جمعہ بھائی اپنی اَن کہی داستان سنانے پر مجبور ہو گئے۔

سوالے کن زمن امروز تا غوغا بہ شہر افتد
کہ اعجازِ فلانے کرد گویا بے زبانے را

میں ان لذیذ حکایات میں سے چند، ہر ممکن اختصار کیساتھ، یہاں درج کرتا ہوں۔

جمعہ بھائی بالعموم راج گڑھ اور حصار کے راستے رات کے وقت بٹھنڈہ جنکشن پہنچتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بیگ ہوتا، جس میں کپڑوں کے دو جوڑے اور دو تین سیر افیون ہوتی تھی۔ اسٹیشن پر محکمۂ آبکاری کے کارندے متوقع ''مہمانوں'' کے استقبال کے لیے پہلے سے منتظر ہوتے۔ گاڑی رُکنے پر جمعہ بھائی اس اطمینان کے ساتھ پلیٹ فارم پر اُترتے کہ ڈیوٹی پر موجود اہلکاروں کو شک بھی نہ گزرتا۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ گاڑی سے اُترتے ہی ایک اہلکار نے اُن کا بیگ تھام لیا اور بڑے وثوق سے پوچھا، ''کتنی

ہے؟" جمعہ بھائی نے کمالِ متانت سے جواب دیا، "بہت ہے! تمھیں کتنی چاہیے؟" یہ پُراعتماد جواب سُن کے وہ شخص بولا، "جا بھائی جا، میرا وقت ضائع نہ کر، مجھے اپنا کام کرنے دے۔" "اپنا کام تو تم خود چھوڑ رہے ہو، میں نے تمھیں کب دعوت دی تھی۔" جمعہ بھائی کا ذومعنی جواب تھا۔ اور وہ بڑی بے نیازی سے بیگ اُٹھائے اسٹیشن سے باہر نکل گئے۔

ایک مرتبہ وہ پلیٹ فارم سے مخالف سمت میں اُترے۔ وہاں ایک سب انسپکٹر ایکسائز موجود تھا جو جمعہ بھائی کے خیال میں نیا نیا بھرتی ہوا تھا۔ اس نے ان کا بیگ کھلوا کر دیکھا۔ اُنھوں نے افیون کو ایک موٹے روٹ کی شکل دی ہوئی تھی۔ اس نے اسے ہاتھ میں تھام کر پوچھا: "یہ کیا ہے؟"

"یہ راستے کا کھانا ہے۔"

"یہ کیسا کھانا ہے؟"

"چکھ کر دیکھ لو۔ ہم صحرائی لوگ سفر پر جاتے ہوئے باجرے کے آٹے میں گڑ وغیرہ ملا کر اس قسم کے موٹے روٹ پکوا لیتے ہیں جو کئی دن تک کام دیتے ہیں۔"

سب انسپکٹر نے اس انوکھی چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور سونگھ کر بولا: "نہیں اُستاد! یہ روٹ ووٹ نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟"

"یہ افیون معلوم ہوتی ہے۔"

"افیون بھلا ایسی ہوتی ہے؟ میرا خیال ہے تم نے افیون کبھی نہیں دیکھی۔ بہرحال اگر تمھیں شک ہے تو ایسا کرو، یہ تم لے جاؤ۔"

"میں کیسے لے جاؤں؟" اس نے گھبرا کر کہا۔

"جیسے میں لایا ہوں۔" اُنھوں نے جواب دیا۔

وہ کچھ سوچ کر کہنے لگا، "اچھا یوں کرتے ہیں، اِسے آدھی آدھی بانٹ لیتے ہیں۔"

غرض جمعہ بھائی نے آدھا روٹ اس کے حوالے کر کے اپنا راستہ لیا۔

ایک دِن عبدالقیوم نے اُن سے پوچھا کہ آپ اِتنے سیانے اور تجربہ کار ہونے کے باوجود پولیس کے ہتھے کیسے چڑھ گئے۔ اُنہوں نے اس کے جواب میں جو داستان سنائی اس کا لب لباب یہ ہے کہ وہ مال لے کر فیروز پور پہنچے۔ وہاں سے آگے کسی قصبے کو جا رہے تھے۔ راستے میں ایک گاؤں کے سکھ زمیندار نے ان سے کچھ افیون خریدی اور شام ہونے کے باعث ان کو قیام کی صلاح دی۔ اُنھوں نے پولیس کے چھاپے کا خدشہ ظاہر کیا۔ سردار جی نے لاف زنی کی، "اوئے پولیس دی کی مجال اے شیر سنگھ دے ڈیرے ول منہ وی کرے۔" اُنھیں اعتبار آ گیا۔ رات کو لمبی تان کر سوئے ہوئے تھے کہ چھاپہ پڑ گیا۔ سردار جی پولیس کی پہلی بھبکی بھی نہ سہہ سکے اور یہ گرفت میں آ گئے۔ سردار جی گواہ بنے اور یوں دو تین پیشیوں ہی میں سزا ہو گئی۔

جمعہ بھائی نے جیل کے دلچسپ واقعات بھی سنائے۔ اُنھیں فیروز پور جیل کی ایک عمومی بارک میں جگہ ملی جس میں کوئی دو درجن قیدی تھے۔ ظاہر ہے کہ اُن کی غالب اکثریت سکھوں پر مشتمل تھی۔ ان میں چھ چھ سات سات افراد کے دو دھڑے قتل کے مقدمات میں ماخوذ تھے۔ ایک کا تعلق تقسیم سے قبل ضلع شیخوپورہ اور دوسرے کا ضلع گوجرانولہ سے تھا۔ اوّل الذکر نے بارک کے مشرقی اور دوسرے نے مغربی حصے پر قبضہ جمایا ہوا تھا۔ جمعہ بھائی کو مشرقی جانب جگہ ملی اور یوں یہ خود بخود شیخوپورہ والے جتھے کے رُکن قرار پا گئے۔ اور تو سب ٹھیک تھا لیکن انہیں نماز کے دوران لوگوں کے سامنے آنے سے دقت ہوتی تھی۔ اس کا حل اُنہوں نے یہ نکالا کہ ایک دِن عصر کی نماز مغربی دیوار کے پاس جا کر پڑھی۔ ابھی سلام پھیرا ہی تھا کہ گوجرانوالیے گروہ کے سرغنہ نے ڈانٹ پلائی: "اوئے توں ساڈے پاسے آ کے اُچا نیواں نہ ہویا کر، آکھ دِتا اے تینوں!" (جمعہ بھائی پنجابی خوب بول لیتے تھے)۔ یہ کوئی جواب دیئے بغیر اُٹھ کر اپنی جگہ آ گئے۔

اُدھر شیخوپوریوں کے سربراہ نے یہ بنکار سُن لی تھی۔ اُس نے دریافت کیا، ''جمعہ! ایہہ تینوں کی کہنداسی؟'' اُنھوں نے بتایا تو وہ طیش میں آ گیا۔ ''اوئے ایہہ دی ایہہ مجال کہ ساڈے بندے نوں اُچا نیواں ہون توں ڈکے۔ جمعہ! توں ہنے ای اوتھے جاتے فیر اُچا نیواں ہو۔ میں ایہنوں ویکھ لیناہاں۔'' جمعہ بھائی نے لاکھ سمجھایا کہ اب نماز کا وقت نہیں ہے، غروب کے بعد وہاں جا کر پڑھ لوں گا، لیکن سردار جی نے ایک نہ سنی اور انہیں وہیں جا کر عصر کی نماز دوبارہ پڑھنا پڑی۔ اب فریقِ ثانی کو انہیں روکنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ پانچوں وقت وہاں جا کر نماز پڑھنے لگے۔

جمعہ بھائی کی شگفتہ مزاجی کے باعث عبدالقیوم نے اُن سے شیخوپورہ آنے کی درخواست کی۔ بولے ''ہاں میں بھی سوچتا ہوں کہ ایک بار خالہ جان سے مل آؤں۔'' عبدالقیوم نے تاکید کی کہ آپ ہمارے جاتے ہی پاسپورٹ بنوا کر ویزا کے لیے درخواست دے دیں۔ کہنے لگے: ''اگر ویزا نہ ملا تو میں اسپیشل پرمٹ پر آ جاؤں گا۔'' ان کا مطلب براہِ راست سرحد پار کر کے آنے سے تھا، لیکن یہ بات محض بربنائے تفنن تھی کیونکہ اب ان کے قویٰ مضمحل ہو چکے تھے۔ اکتوبر ۱۹۸۳ء میں دادی جان کا انتقال ہو گیا اور یوں جمعہ بھائی کی پاکستان آنے میں اصل دلچسپی ختم ہو گئی۔ ۱۹۹۰ء میں ہم پھر چند روز کے لیے شیرانی آباد گئے۔ اس مجسّم شگفتگی کا عالمِ ضعیفی دیکھ کر مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ ہماری واپسی کے وقت وہ کئی دوسرے لوگوں کے ساتھ ہمیں الوداع کہنے مکرانہ اسٹیشن تک آئے۔ بس یہ آخری ملاقات تھی اور اب ان کی سناونی آ گئی:

خویشان و موافقاں ہمہ از دست شدند   در پای اجل یکاں یکاں پست شدند
خوردیم شرابِ عمر در یک مجلس   دورِ دوسہ پیش تر زمامست شدند

-----◆○◆-----

مرزا مصیبت بیگ

اصلی نام تو ان کا احمد بیگ تھا لیکن ان کی زبان اور عملی مذاق کا نشانہ بننے والوں نے اپنی جھونجھل اتارنے کے لیے انھیں مصیبت بیگ کا لقب دے رکھا تھا۔ ان پر یہ نام ایسا صادق آیا کہ مقبولِ عام ہو گیا۔ ان کی پیٹھ پیچھے ہر کہ ومِہ انھیں اسی لقب سے یاد کرتا تھا لیکن سامنے یہ جرأت کسی کسی کو ہوتی تھی۔ ان کے والد مرزا محمد بیگ ٹونک میں نواب صاحب کے سواروں میں تھے۔ سپاہی مَنش آدمی مگر غصہ ناک پر رکھا رہتا تھا۔ دماغ کی پھرکی گھوم جاتی تو لام کاف پر اُتر آتے۔ ذات کے کھرے مغل تھے۔ ان کے چہرے کی ساخت اور رخساروں کی ہڈیاں وسط ایشیا سے ان کے آبائی تعلق کی چغلی کھاتی تھیں۔ ان کی شادی پٹھان خاندان میں ہوئی تھی اس لیے اولاد کے چہروں سے اُزبک اثرات محو ہو گئے تھے۔ ان کے چھ فرزندوں میں ہمارے مرزا صاحب سب سے بڑے تھے۔ سب ہی خوش رُو اور خوش اندام تھے اور مرزا صاحب کی حیثیت تو گلِ سرسبد کی سی تھی۔ مزاج کے اعتبار سے مرزا صاحب اپنے والد کے بالکل الٹ تھے۔ نہایت مہذب، ادب آداب سے واقف، گالی گلوچ سے متنفر، حسنِ کلام اور ردّ جواب میں طاق، خوش ذوق، خوش پوشاک۔ ٹونک میں معمولی نوشت وخواند کے بعد اٹھارہ اُنیس برس کی عمر میں وہ بھی ریاست کے رسالے میں بھرتی ہو گئے تھے۔ بمشکل دو سال نوکری کی ہوگی کہ ۱۹۴۸ء میں ٹونک بھی بعض دوسری ریاستوں کی طرح راجستھان یونین میں ضم کر دی گئی اور مرزا صاحب نوکری چھوڑ کر خاندان کے دوسرے افراد کے

ساتھ پاکستان منتقل ہو گئے۔ لاڑکانہ ان کا مستقر ٹھہرا۔

مرزا صاحب سے میری شناسائی ۱۹۶۴ء میں میری شادی کے بعد ہوئی۔ دراصل بڑے مرزا صاحب رشتے میں میری خوش دامن کے ماموں ہوتے تھے۔ میرے خسر کے پہلے دو بچے طفولیت ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنا غم غلط کرنے کے لیے مرزا احمد بیگ کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا تھا۔ مرزا صاحب ہی نے انھیں ''بھائی صاحب'' کہنے کی طرح ڈالی تھی اور پھر یہ تخاطب عمومیت اختیار کر گیا۔

مرزا صاحب کی سب سے بڑی خوبی ان کی شگفتہ رُوئی تھی۔ میں نے انھیں گمبھیر سے گمبھیر صورتِ حال میں بھی آزردہ نہیں دیکھا۔ ایک لطیف سی مُسکان ہمہ وقت ان کے چہرے پر سجی رہتی تھی۔ ناک کے دائیں طرف رخسار کے بالائی حصے پر ایک مسّہ تھا جو ان کے گورے چٹے چہرے پر بڑا زیب دیتا تھا۔ خوش مزاجی ہمیشہ سے میری کمزوری رہی ہے اور خندہ رُو لوگوں سے میری خوب پٹتی ہے چنانچہ ابتدائی تعارف کے بعد جلد ہی ہم ایک دوسرے کے نزدیک آ گئے۔ عمر میں مجھ سے چند سال بڑے ہونے کے باوجود وہ میرا بڑا لحاظ کرتے تھے اور میں بھی ان کا احترام ملحوظ رکھتا تھا۔ میرے سسرال میں انھیں گھر کے ایک فرد کی حیثیت حاصل تھی۔

مَیں جب تعطیلات میں لاڑکانہ جاتا تو میری کوشش ہوتی کہ زیادہ سے زیادہ وقت مرزا صاحب کے ساتھ گزرے۔ ہماری شبینہ محفلوں کے تو وہ روح و رواں تھے۔ تاش کے بڑے رسیا۔ بازی کے دوران میں اپنے ڈرامائی انداز سے پُر لطف کیفیات پیدا کرتے رہتے تھے۔ ان کی محض موجودگی ہی سے ایک عجیب سی تسکینِ خاطر کا احساس ہوتا تھا جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ یہی حال ان کی گفتگو کا تھا، جس میں ان کی زندہ دِلی کے آئینہ دار بیسیوں نکات کی عکاسی میرے تو کیا کسی کے بھی بس کی بات

نہیں۔ بھلا خوشبو بھی کبھی مُٹھی میں بند ہوئی ہے؟

روزمرّہ کے واقعات اور معمول کی صورتِ حال سے مزاح پیدا کرنے سے قطعِ نظر ان کے اصل جوہر عملی مذاق کے منصوبے سوچنے اور ان کی جزئیات میں رنگ بھر کر پیش کرنے میں آشکار ہوتے تھے۔ شاید ہی کوئی دِن ایسا جاتا ہو جب مرزا صاحب کسی نہ کسی شخص کو اپنی ستم ظریفی کا نشانہ نہ بناتے ہوں۔ بعض لوگ تو ان کا مستقل ہدف تھے۔ ان میں محلے کے ایک صاحب تھے جن کا اصل نام تو مجھے معلوم نہیں لیکن لڑکے بالے انھیں چھٹو چچا کہتے تھے۔ چھوٹا سا قد، منحنی جسم، چھوٹی سی سیاہ ڈاڑھی، زبان میں لکنت تھی۔ جب گفتگو میں زبان اٹک جاتی تو وہ سر اور دست و بازو کی مدد سے بات سمجھانے کی کوشش کرتے۔ ٹھیلے پر سبزی اور موسمی پھل وغیرہ بیچتے تھے، مگر تھے بڑے زندہ دِل۔ گلی کوچوں میں آواز لگاتے ہوئے مختلف سبزیوں کے نام پکار کر آخر میں ''سویا'' کا نام لیتے اور اس کے ساتھ قافیہ آرائی کرتے' مثلاً ''رویا دھویا اور رو دھو کے سویا'' یا ''رویا دھویا اور مار کھا کے سویا۔'' لاڑکانہ میں امرود بہت ہوتا ہے اور موسمِ گرما کے امرودوں میں کیڑے بھی بہت پڑتے ہیں۔ چھٹو چچا جس دن امرودوں کا ٹھیلا لے کر نکلتے تو دھڑلے سے آواز لگاتے ''کیڑوں کے ڈھیر دو آنے سیر۔'' لطف یہ ہے کہ یہ آوازیں لگاتے وقت زبان کی لکنت مطلق سدِّ راہ نہ ہوتی تھی۔ ایسا خوش طبع اور بے ضرر آدمی خدا جانے مرزا صاحب کی ہٹ لسٹ پر کیونکر آ گیا۔

چھٹو چچا کا مکان چھوٹا سا تھا۔ گرمی کے موسم میں وہ بھی بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح گھر کے آگے گلی میں چارپائی ڈال کر سو جاتے تھے۔ پاس ہی ان کا خالی ٹھیلا کھڑا ہوتا۔ سارے دن کی کوچہ گردی کے بعد وہ اتنے تھک جاتے تھے کہ پَو پھٹے تک ٹس سے مس نہ ہوتے۔ ایک رات عجیب واقعہ ہوا یعنی چھٹو چچا علی الصبح بجائے اپنی چارپائی کے، شہر کے دوسرے سرے پر واقع سبزی منڈی میں اپنے ٹھیلے پر سوتے ہوئے

پائے گئے۔ پرانے خیال کے لوگوں نے اسے جنوں کی کارستانی بتایا۔ معقولیت پسندوں کا کہنا تھا کہ دراصل چھٹو چچا غنودگی کی حالت میں وقت سے پہلے ٹھیلا لے کر منڈی پہنچ گئے ہوں گے۔ جب وہاں جا کر اپنی غلطی کا احساس ہوا تو بجائے واپس آنے کے، ٹھیلے ہی پر گٹھڑی بن کر پڑ گئے۔ لیکن موصوف کو اس سے انکار تھا۔ وہ ہکلا ہکلا کر اس خیال کی تردید کرتے رہے۔ اس موقع پر مرزا صاحب بھی مختلف توجیہات کرنے میں پیش پیش تھے۔

پھر یہ حرکت ہفتے عشرے کے وقفے سے بار بار ہونے لگی۔ تنگ آ کر چھٹو چچا نے ٹھیلے کے پہیے میں زنجیر ڈال کر تالا لگا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب ان کی کھٹیا ہی اُڑن کھٹولا بن گئی اور مع چھٹو چچا شہر کے مختلف مقامات پر پائی جانے لگی۔ ایک رات اس کارروائی کے دوران میں چھٹو چچا کی آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ چند نقاب پوش ان کی چارپائی اس انداز میں لیے جا رہے ہیں جیسے کسی ہسپتال کے کارندے اسٹریچر پر مریض کو آپریشن تھیٹر لے جاتے ہیں۔ یہ نظارہ دیکھ کر انھوں نے شور مچانا چاہا تو اغوا کنندگان نے اشاروں کنایوں سے انھیں دھمکایا۔ غریب نے خاموشی ہی میں عافیت سمجھی۔ ایک مقام پر پہنچ کر اخفا کی غرض سے چارپائی کی ادوائن نکالی گئی اور چھٹو چچا کو چارپائی کے ساتھ باندھ کر چھوڑ دیا گیا۔ بے چارے جاگ جانے کے باوجود اپنے کسی مہربان کو پہچاننے میں ناکام رہے۔ البتہ اس کے بعد انھیں اس مفت کی سیر سے نجات مل گئی۔ میرے خیال میں یہ سارا معاملہ پیشہ ورانہ رقابت کا تھا۔ جس طرح ایک فن کا ماہر اُسی فن کے دوسرے ماہرین کو اپنا مدِ مقابل تصور کرتا اور انھیں نیچا دکھانے کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتا ہے اسی طرح مرزا صاحب بھی کسی پُرمزاح اور تیز طرّار شخصیت کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور اسے مات دینے کی کوشش کرتے تھے۔ میرے اس قیاس کی تصدیق ایک اور واقعے سے ہوتی ہے۔

لاڑکانہ میں ایک باغ و بہار شخصیت حبیب احمد کی تھی۔ اس کے کمالات ایک الگ مضمون کے متقاضی ہیں۔ اس کا چھوٹا بھائی مجیب بھی کچھ کم نہ تھا بلکہ ان کے والد، جنھیں سب قاضی صاحب کہتے تھے، ان کے بھی باپ تھے، گویا ہمہ خانہ آفتاب والا مضمون تھا۔ لیکن ہمارا میل جول حبیب سے تھا۔ جب وہ اور مرزا صاحب یکجا ہوتے تو گویا لوہے سے لوہا ٹکراتا تھا۔ زبانی کلامی دونوں برابر کی چوٹ تھے مگر مرزا صاحب کا عملی پہلو زیادہ قوی تھا چنانچہ انھوں نے اس سے کام لیتے ہوئے حبیب کو زک پہنچانے کا منصوبہ بنایا۔ مرزا صاحب کے بچے کے عقیقہ کی تقریب تھی۔ انھوں نے حبیب کو بھی مدعو کیا۔ مغرب کے بعد دسترخوان بچھا۔ بہت سے مہمان تھے۔ مرزا صاحب خود تو کسی بہانے موقع سے ٹل گئے البتہ بڑے مرزا صاحب، جو حبیب سے واقف نہ تھے، وہاں موجود تھے۔ ابھی کھانا شروع نہ ہوا تھا کہ ایک نوجوان نے، جو ظاہر ہے ہمارے مرزا صاحب کا کارکن تھا، ان کے پاس جا کر کہا کہ یہاں بعض ایسے لوگ موجود ہیں جو بن بُلائے چلے آئے ہیں اور ہم میں سے کوئی انھیں نہیں جانتا۔ بڑے مرزا صاحب نے پوچھا ''مثلاً؟'' اس نے چپکے سے حبیب کی طرف اشارہ کر دیا۔ بڑے میاں کی چڑھائی کیا تھی، شیر کا حملہ تھا۔ ''کون ہے بے تُو؟'' اس بات کا وہ غریب کیا جواب دیتا۔ دائیں بائیں شناساؤں کی طرف دیکھا لیکن سب آنکھیں چرا گئے۔ نتیجہ یہ کہ بھری محفل سے غریب کو بیک بنی و دوگوش نکلنا پڑا۔ اس کے باہر نکلتے ہی مرزا صاحب پہنچ گئے۔ اُدھر دسترخوان پر بیٹھے ہوئے نوجوان بھی اٹھ آئے۔ مرزا صاحب نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ بڑے صاحب کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں اس لیے یہ افسوس ناک صورت حال پیدا ہوئی۔ پھر سب کے سب حبیب کو ساتھ لے کر برابر والے مکان میں جا بیٹھے اور مل کر کھانا کھایا۔

مرزا صاحب کے ترتیب دیے ہوئے ڈراموں میں حصہ لینے والے اہم اور

غیر اہم اداکاروں کی ایک طویل فہرست تھی۔ ضرورت کے وقت مہمان اداکاروں سے بھی کام لے لیا جاتا تھا۔ ان جیسا ماہر ہدایت کار ملنا مشکل ہے۔ بڑی سنجیدگی سے اپنے ''معمول'' سے محوِ گفتگو ہیں اور چشم و ابرو کی مدد سے اپنی ٹیم کو ہدایات بھی دی جا رہی ہیں۔ قاضی جی کے چوہے بھی سیانے۔ ان کے کارکن ان کا اشارۂ ابرو سمجھتے تھے۔ باز سے شکار کھیلنے والوں کا قاعدہ ہے کہ جونہی ان کا سدھایا ہوا پرندہ کوئی فاختہ وغیرہ شکار کرے، وہ اسے ذبح کرتے ہی اس کا دل نکال کر حوصلہ افزائی کے لیے باز کو کھلا دیتے ہیں۔ مرزا صاحب کا بھی اسی اصول پر عمل تھا۔ فراخ دِل اور کشادہ دست آدمی تھے اور اپنے حواریوں کی فواکہات و مشروبات سے تواضع کرتے رہتے تھے۔ شاید اسی تقریب سے شرط لگانے کا شوق بھی پالا ہوا تھا۔ ہر وقت اور ہر جگہ شرط لگانے پر آمادہ رہتے۔ ان شرطوں کی جزا مٹھائی کی صورت میں ہوتی جو ہارنے والا فی الفور منگواتا اور تمام حاضرین اس سے شیریں کام ہوتے۔ ظاہر ہے کہ ان شرطوں میں جیت ہمیشہ مرزا صاحب کی ہوتی تھی۔ ہاں کبھی کبھی حکمت عملی کے تحت ہار بھی جاتے تھے تا کہ لوگوں میں اعتبار جما رہے اور وہ ان کی یک طرفہ کامیابیوں سے بددل ہو کر شرط لگانا ہی نہ چھوڑ دیں۔

یہ شرطیں عموماً کسی کھیل مثلاً تاش، کیرم بورڈ، چھپو وغیرہ پر لگتیں لیکن ان کا میدان نہایت وسیع تھا۔ میں یہاں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ لاڑکانہ شہر سے مغرب کی سمت بیس بائیس میل دور ایک بڑا گاؤں ہے گاجی کھاوڑ۔ وہاں کچھ عزیزوں کی زرعی زمین تھی اور وہ رہتے بھی وہیں تھے۔ یہ تین بھائی تھے جن میں بڑے ثناء اللہ خاں تھے اور منجھلے کی عُرفیت چھوٹے خاں تھی۔ یہ لوگ مختلف کاموں کے سلسلے میں لاڑکانہ آتے رہتے تھے۔ ایک بار چھوٹے خاں آئے ہوئے تھے۔ رات کو سندھی محاورے کے مطابق کچہری ہو رہی تھی کہ چھوٹے خاں نے مرزا صاحب کو مبارزانہ انداز میں مخاطب کیا:

''مرزا! سُنا ہے تم شرطیں بہت لگاتے ہو؟''

''بھئی شرط لگانے کے لیے کوئی لائسنس تو لینا نہیں پڑتا۔ یہ تو ایسی چیز ہے جو ہوا اور پانی کی طرح ہر شخص کے اختیار میں ہے۔ آپ بھی لگا سکتے ہیں۔'' مرزا صاحب نے چھوٹے خاں کا لہجہ بھانپتے ہوئے دعوت دی۔

''کیا شرط لگائیں اور کاہے کی؟''

''جو چاہیں لگائیں! رہا چیز کا سوال تو موجود افراد کے لیے صرف دو سیر مٹھائی کافی ہوگی۔''

''تاش واش کھیلنا تو ہمیں آتا نہیں، تم ہی کوئی تجویز دو۔''

''اب آپ مہمان ہیں۔ آپ کو کسی مشکل میں ڈالنا اچھا نہیں لگتا۔ شیخ عبدالمجید صاحب کو تو آپ جانتے ہیں۔ پاس ہی رہتے ہیں۔ آپ ان کو کسی بھی بہانے سے بلا لائیں تو آپ جیتے اور ہم ہارے۔ ناکامی کی صورت میں آپ کو ہار ماننا پڑے گی۔''

اب ان شیخ صاحب کی سنیے۔ ان کی عمر نوے سال کے قریب تھی اور عرصۂ دراز سے ان کا دستور تھا کہ عشاء کی نماز پڑھ کر جو لیٹتے تو قطب از جانمی جنبد کا مصداق بن جاتے تھے۔ آندھی آئے، سیلاب آئے، بھونچال آئے، ان کو تہجد سے قبل گھر سے باہر لانا تو کجا' چارپائی پر اٹھا کر بٹھانا بھی ناممکنات میں سے تھا۔ ادھر یہ گفتگو جاری تھی کہ مرزا صاحب کا اشارہ پا کر ایک کارندہ شیخ جی کے پاس پہنچا اور حفظِ ماتقدم کے طور پر ان کا پیغام دیا کہ اگر آپ چھوٹے خاں کی درخواست پر چلے آئے تو دو سیر مٹھائی آپ سے وصول کروں گا۔ جواب ملا ''اس سے کہنا کہ میرا باپ قبر سے اُٹھ کر آ سکتا ہے، میں چارپائی سے نہیں اُٹھ سکتا۔'' ذرا دیر بعد چھوٹے خاں بڑے گھبرائے ہوئے پہنچے اور شیخ جی سے مخاطب ہوئے ''قبلہ! گھر میں بچھو کاٹ گیا ہے۔ سخت تکلیف ہے۔ جلدی سے چل کر جھاڑ دیں۔'' جواب ملا ''بیٹا! بچھو تو کیا اگر سانپ بھی ڈس لے تو میں اس

وقت آنے والا نہیں۔'' چھوٹے خاں نے بڑا زور لگایا، بڑے واسطے دیے پر بڑے میاں ٹس سے مس نہ ہوئے اور چھوٹے خاں کو شرط ہارنی پڑی۔

شیخ سعدی نے کہا ہے:

اگر صد سال گبر آتش فروزد

چو یک دم اندرو افتد بسوزد

مرزا صاحب کا حال بھی آگ کا سا تھا۔ اگر انھیں کوئی شکار نہ ملتا تو اپنے کسی کارکن ہی پر ہاتھ صاف کرلیا کرتے تھے۔ اس طرح اس کی تربیت بھی ہو جاتی تھی اور ایاز قدرِ خود شناس کا سبق دینا بھی مقصود ہوتا تھا۔

جلیل احمد عرف جلّو بھائی ان کے منجھے ہوئے کارکن تھے۔ ان کے ماموں ایک طویل عرصے بعد بہاولپور سے آئے۔ مرزا صاحب انھیں فلم دکھانے لے گئے۔ جلّو بھائی اور محمد حنیف خاں کو بھائی صاحب نے کسی کام سے بھیجا تھا۔ یہ واپسی میں رائل ٹاکیز کے سامنے سے گزرے تو مرزا صاحب نظر پڑے۔ جلّو نے ماموں جان کی آنکھ بچا کر ان سے پوچھا ''مرزا جی! ہم بھی فلم دیکھیں؟'' مرزا صاحب بھانپ گئے کہ اس وقت ان کی جیب خالی ہے۔ بولے ''ہاں ہاں! کیوں نہیں، تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے، ہماری آنکھوں سے تو دیکھو گے نہیں، ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' اس بظاہر حوصلہ افزا جواب پر یہ دونوں وہیں رک گئے۔ کچھ دیر بعد مرزا صاحب سینما ہال سے متصل ہوٹل میں مہمان کی چاء پیسٹری وغیرہ سے تواضع کرنے لگے اور ان کی طرف مطلق توجہ نہ کی۔ حنیف خاں کا ماتھا ٹھنکا تو انھوں نے جلّو بھائی سے کہا ''آج مرزا صاحب کے طور ٹھیک نہیں ہیں۔ ابھی فلم شروع ہونے میں کچھ دیر ہے۔ گھر چل کر پیسے لے آتے ہیں۔'' جلّو نے اس خیال کو مسترد کرتے ہوئے جواب دیا ''کوئی نئی بات تو ہے نہیں۔ بیسیوں فلمیں مرزا صاحب نے ہم لوگوں کو دکھائی ہیں۔ چائے کی کوئی بات

نہیں۔ فلم ضرور دکھائیں گے۔"

ادھر مرزا صاحب کا مقصد انھیں آس دلائے رکھنا تھا کہ یہ گھر جا کر پیسے نہ لا سکیں۔ اسی لیے وہ مہمان کے ساتھ لگے رہے تاکہ جلّو کو بات کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ ٹکٹوں کی کھڑکی کھلی تو مرزا صاحب نے جا کر ٹکٹ لیے اور ایک نگاہِ غلط انداز دور سے ان دونوں پر ڈالی۔ آنکھیں چار ہوئیں تو جلّو نے اشارے سے پوچھا کہ ہمارے ٹکٹ بھی لیے ہیں نا؟ مرزا صاحب نے حوصلہ افزا اشارہ کیا۔

اس موقع پر حنیف خاں نے پھر جلّو کو کھسک لینے کا مشورہ دیا لیکن اس کی تو شامت آئی ہوئی تھی۔ مہمان کو ہال میں داخل کر کے مرزا صاحب گیٹ کیپر کو ٹکٹ دکھانے لگے تو جلّو لپک کر پہنچا۔ اس ڈرامے کا نقطۂ عروج جلّو ہی کے الفاظ میں سنیے جس نے گھر پہنچتے ہی مجھے اپنی بپتا سنائی تھی: "میں نے دبی زبان میں مرزا صاحب سے پوچھا کہ ہمارے ٹکٹ کہاں ہیں؟" میرا یہ پوچھنا تھا کہ ایسا معلوم ہوا جیسے بم پھٹ گیا ہو۔ پوری قوت سے دھاڑے: "ارے یارو! اگر تمھاری جیب میں پیسے نہیں ہوتے تو آخر کیوں آ جاتے ہو گھر سے فلم دیکھنے۔" عین اُس وقت ماموں جان ہال میں سے مسکراتے ہوئے نکلے۔ میرا وہ حال کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ مرزا صاحب ماموں جان کا ہاتھ پکڑ کر ہال میں داخل ہو گئے اور میں مرے مرے قدموں سے حنیف کے پاس آیا۔ وہ بولا "میں نے تمھیں پہلے ہی کہا تھا کہ آج مرزا صاحب کے تیور ٹھیک معلوم نہیں ہوتے۔" اب میں کیا کہتا۔ خود کردہ را علاجے نیست۔ کہتے ہیں چڑیل بھی سات گھر چھوڑ دیتی ہے۔ یہ ایک بھی نہیں چھوڑتے۔ سچ پوچھو تو لوگوں نے ان کا نام مرزا مصیبت بیگ صحیح رکھا ہے۔"

میں نے جلّو سے پوچھا کہ چلو مرزا صاحب سے تو یہ کچھ بعید نہ تھا لیکن ماموں جان نے اس معاملے میں دخل کیوں نہ دیا؟ بولا: "معلوم ہوتا ہے آپ مرزا صاحب کو

نہیں جانتے۔ انھوں نے ماموں جان کو پہلے ہی اعتماد میں لے کر ان کی زبان بندی کر دی ہو گی۔" اور پھر فلم سے واپس آ کر موئے پر سَو دُرّے کے مصداق مرزا صاحب نے رات کے کھانے پر سب کے بیچ میں بیٹھ کر غریب جلّو کا وہ جلوس نکالا کہ توبہ ہی بھلی۔ مجھے اس موقع پر بے اختیار نظیری کا شعر یاد آیا:

بہ کسے نشیں نظیری کہ ز نیش نوش بخشد
چہ تمتّع و حلاوت ز حدیثِ بے گزنداں

مرزا صاحب کوئی کاروبار تک کرنہیں کرتے تھے۔ مَیں ۱۹۶۹ء کے موسم گرما کی چھٹیوں میں لاڑکانہ گیا تو پتہ چلا کہ انھوں نے گاجی کھاوڑ میں زرعی زمین خرید لی ہے اور وہاں منتقل ہو گئے ہیں۔ مجھے ان کی صحبت سے محرومی کا شدید احساس ہوا لیکن اگلے ہی دن وہ لاڑکانہ پہنچ گئے۔ میں نے پوچھا کہ یہ آپ کو کیا سوجھی؟ بولے "زمین سستی مل رہی تھی اور تھی بھی ثناء اللہ خاں کی زمین کے ساتھ اس لیے لے لی۔"

"کیا بھاؤ ملی؟" میں نے سوال کیا۔

"بھاؤ تاؤ تو کچھ کیا نہیں۔ ایک تو میں نے وہ بھینس دی جس کا دودھ سوکھ گیا تھا، دوسرے فلپس کا سات بینڈ کا ریڈیو اور ہاں بارہ سو روپے نقد بھی دیے۔"

میں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گیا اور کہا "یہ آپ شہید مردوں سے بھی دل لگی کرنے لگے؟" بولے "بخدا اس سے زیادہ کچھ نہیں دیا۔"

"تو پھر آیندہ ادائیگی کا وعدہ ہو گا؟"

"ہرگز نہیں۔ وہ شخص زمین میرے نام منتقل کرا گیا ہے۔"

دراصل قصہ یہ تھا کہ زمین کا مالک کراچی میں رہتا تھا۔ سال میں دو بار فصل کے موقع پر اِدھر کا چکر لگاتا۔ حاصل حصول کچھ تھا نہیں۔ مزارع سب کچھ ڈکار جاتا اور الٹا اخراجات کے نام پر مطالبے کرتا رہتا۔ وہ بھلا آدمی زمین کو یونہی چھوڑنا چاہتا تھا کہ

اسے مرزا صاحب مل گئے۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ ایسے بدمعاش مزارع کے سر پر کوئی جن مسلّط کر جاؤں۔ مرزا صاحب نے لینے کو تو زمین لے لی اور بٹائی بھی وصول کرنے لگے لیکن ان جیسے مجلسی آدمی کا دل گاؤں کے ٹڑے میں کہاں لگتا۔ ان کا زور اس بات پر ہوتا کہ لاڑکانہ سے دوست عزیز آتے رہیں اور رونق لگی رہے۔ شروع شروع میں لوگ گئے بھی لیکن جو ایک بار ہو آتا دوسری مرتبہ جانے کا نام نہ لیتا۔ وجہ یہ تھی کہ مرزا صاحب کسی کو واپس نہیں آنے دیتے تھے۔ لاکھ سر پٹکتے لیکن وہاں ان کی فریاد کون سنتا۔ گاجی سے ایک بس علی الصبح روانہ ہو کر لاڑکانہ آتی اور سہ پہر کو واپس جاتی تھی۔ رات گاؤں میں ٹھہرتی۔ مرزا صاحب شام کے وقت نو وارد مہمان کو ساتھ لے کر گھمانے کے بہانے نکلتے۔ بس اڈے سے گزرتے ہوئے ڈرائیور اور کنڈکٹر کے کان میں پھونک مار دیتے کہ میرے مہمان کو غور سے دیکھ لو۔ اگر کسی دن یہ بس میں سوار ہوں تو انھیں ہرگز لے کر نہ جانا ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ لیجیے فرار کا واحد راستہ مسدود ہو گیا۔ ایک بار ایک قفس بستہ نے فرار کی کوشش کی اور کنڈکٹر کی آنکھ بچا کر بس کی پچھلی سیٹ پر دبک کر بیٹھ گیا۔ ادھر مرزا صاحب نے قیدی کی غیر موجودگی محسوس کر لی اور ایک مختصر راستے سے بس کو آ لیا۔ فراری نے داروغۂ زنداں کو دیکھ کر چھپنے کی کوشش کی۔ مرزا صاحب نے کنڈکٹر کو آڑے ہاتھوں لیا اور واپس لوٹ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر انھوں نے پیٹھ پھیری اور اُدھر کنڈکٹر نے اس بے چارے کو بس سے اتار دیا۔

ع : اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔

جولائی ۱۹۷۰ء میں مجھے بھی مرزا صاحب کے پیہم اصرار پر ان کے گاؤں جانے کا اتفاق ہوا لیکن میں تنہا جانے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ چھ سات افراد مل کر پہنچے۔ ان میں بھائی صاحب اور محمد سلیم خاں جیسے لوگ بھی تھے جن کے سامنے مرزا صاحب دم نہیں مار سکتے تھے۔ ہم نے تین دن قیام کیا۔ اس عرصے میں مرزا صاحب کی

جولانیِ طبع اور خاطر داری اپنے عروج پر تھی۔ اب وہ دن یاد آتے ہیں تو دل میں ہُوک سی اُٹھتی ہے۔

گاجی کھاوڑ میں ثناء اللہ خاں صاحب سال میں ایک بار قوالی کی محفل سجاتے تھے۔ کوئی اچھا قوال بلوایا جاتا اور اُس رات گاؤں میں جشن کا سماں ہوتا۔ مرزا صاحب کے وہاں قیام کے دوران میں یہ موقع آیا۔ عشاء کی نماز کے بعد قوالی شروع ہوئی۔ مرزا صاحب رشتے اور عمر میں بڑے ہونے کے سبب ثناء اللہ خاں کا احترام کرتے تھے۔ وہ تھے بھی بڑے متین اور دھیمے مزاج کے آدمی لیکن اُس دن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ کسی قوالی پر خان صاحب کو حال آ گیا۔ انھوں نے کھیلنا شروع کیا تو قوال مصرع کی تکرار کرنے لگے۔ اتفاق سے مرزا صاحب، خاں صاحب کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس سرگرمی میں ایک بھرپور ہاتھ ان کے بھی پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد جب خان صاحب اپنے آپ میں آئے تو چائے کا وقفہ ہوا۔ اس اثنا میں مرزا صاحب نے سوچا کہ حال طاری ہونے والے شخص کی مار بھی کیا خوب شے ہے جس کی داد نہ فریاد۔ اب جو وقفہ کے بعد دوبارہ قوالی شروع ہوئی تو مرزا صاحب پر حال ''طاری'' ہو گیا۔ دوسرے تو محض برائے بیت ان کا نشانہ بنے مگر خان صاحب سے انھوں نے اگلے پچھلے سارے حساب بے باق کر دیے۔ آخر خدا خدا کر کے مرزا صاحب بے دم ہو کر گر پڑے اور خاصی دیر بعد ''ہوش'' میں آئے۔ یہ ڈرامہ انھوں نے اس صفائی سے کھیلا کہ کسی کو ذرا بھی شک نہ ہو پایا۔ اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں جب لاڑکانہ میں بھی کہیں قوالی کی محفل ہوتی تو مرزا صاحب اپنے چیلوں کو لے کر پہنچ جاتے اور اس کرتب کا اعادہ کرتے۔ حال لانے سے پیشتر ہی وہ کسی شخص کو تاڑ کر اپنا خصوصی ہدف مقرر کر لیا کرتے تھے۔

مرزا صاحب ۱۹۷۱ء میں گاؤں کا قیام ترک کر کے لاڑکانہ آ گئے، گویا مچھلی پانی میں لوٹ آئی۔ اب وہی مجلسیں تھیں اور وہی چُہلیں۔ ۱۹۷۳ء میں لاہور سے میرے

دوست پروفیسر فضیلت حسین کراچی جاتے ہوئے دو تین روز کے لیے لاڑکانہ پہنچے۔ گرمی شدید تھی۔ دن ڈھلا تو انھوں نے مرزا صاحب سے ملاقات کا تقاضا کیا جن کے اوصاف وہ مجھ سے سن چکے تھے۔ معلوم ہوا کہ حضرت اس وقت لاہوری محلّے والی چکّی پر ملیں گے۔ ہم لوگ وہیں جا دھمکے۔ مرزا صاحب بڑے خوش ہوئے۔ ہوٹل کے چھوکرے کو بلا کر سپیشل چائے کا آرڈر دیا۔ پھر اٹھ کر اندر گئے اور ذرا دیر بعد ایک پلیٹ لا کر فضیلت صاحب کے سامنے رکھی اور بولے "جب تک چائے آئے آپ فروٹ سے شوق فرمائیں۔" پلیٹ میں خدا جانے کب کے سنبھالے ہوئے جھڑبیری کے سوکھے کھنک بیر تھے۔ یہ دیکھ کر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ واپسی پر فضیلت صاحب نے مرزا صاحب کا "حال" دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ بظاہر اس کی گنجائش نظر نہیں آتی تھی کیونکہ اگلے دن کراچی سے مرزا صاحب کی چھوٹی بہن کی برات آنا تھی۔ رات کو مرزا صاحب آئے تو میں نے مہمان کی فرمائش ان کے گوش گزار کی۔ میرا خیال تھا کہ وہ وقت کی نزاکت کے پیش نظر صاف انکار کر دیں گے لیکن ناممکن کا لفظ ان کی لغت میں تھا ہی نہیں۔ کہنے لگے "کل تو کسی صورت ممکن نہیں۔ پرسوں رات دیکھیں گے۔" "اور قوالوں کا انتظام کیسے ہوگا؟" میں نے دریافت کیا۔ "قوالوں کی کیا ضرورت ہے؟ اتنے لڑکے بالے ہیں۔ خود ہی کچھ کر لیں گے۔ دیوانہ را ہوئے بس است۔"

دو دن بڑے مصروف گزرے۔ اس سے اگلے دن برات کو واپس کراچی جانا تھا۔ مرزا صاحب پہر رات گئے آئے۔ مَیں نے پوچھا "کیا ارادے ہیں؟" جواب ملا "ارادے تو نیک ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ معمول کسے بنایا جائے؟"

"دولھا ہی کو بنا لو" ایک نامعقول نے مشورہ دیا۔ مرزا صاحب نے اسے گھورتے ہوئے کہا "ایسی بے بھاؤ کی پڑیں گی کہ گننے والا نہیں ملے گا۔" یہ اشارہ بڑے مرزا صاحب کی طرف تھا۔ پھر کچھ سوچ کر بولے: "براتیوں میں بابر نام کا ایک

سولہ سترہ برس کا لڑکا ہے۔ بڑا شوخ اور چنچل۔ بوٹی بوٹی پھڑکتی ہے۔ اگر وہ آ جائے تو بڑا موزوں رہے گا۔" غرض مرزا صاحب نے اپنے طور پر یہ مرحلہ بھی طے کر لیا۔

دس بجے کے بعد ڈھولکی پر تھاپ اور گھڑے پر ہاتھ پڑا۔ بابر نے کراچی کے تازہ رائج گیت سنائے۔ ادھر سے "ہے جمالو" سے لے کر خواجہ غریب نواز کی منقبت تک پر طبع آزمائی ہوئی۔ لڑکوں نے سماں باندھ دیا۔ اتنے میں مرزا صاحب، جو مصلحتاً اب تک غیر حاضر تھے، تشریف لے آئے۔ اندر جھانکا تو سب نے خیر مقدمی نعرہ لگایا۔ بولے "بھئی اپن نہیں آئیں گے۔ تم لوگ وہ نظم گا کر ہمیں پریشان کرو گے۔" دراصل مرزا صاحب ایک عرصے سے "لال موری پت رکھیو بھلا جھولے لالن" والی نظم کو اپنے "حال" کے لیے مخصوص کر چکے تھے اور یہ اشارہ اسی طرف تھا۔ آخر سب کے اصرار پر آ ہی گئے۔ ان کے بیٹھتے بیٹھتے میں نے سُنا کہ ایک گُرگا بابر کو مرزا صاحب کی متوقع پریشانی سے مطلع کر رہا تھا: "ان پر کوئی جلالی بزرگ آتے ہیں اس لیے یہ ایسی محفلوں سے گھبراتے ہیں۔"

بابر کے چہرے پر دلچسپی کی رمق صاف نظر آ رہی تھی۔ خیر دو ایک چیزیں اور پیش ہوئیں۔ پھر اس مَنڈلی نے آنکھوں آنکھوں میں بات کر کے "لال موری پت رکھیو" کا آغاز کر دیا۔ مرزا صاحب نے اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن دونوں طرف سے بازو پکڑ کر بٹھا دیے گئے۔ فضیلت صاحب نقطۂ عروج سے لطف اندوز ہونے کے لیے چوکنّے بیٹھے تھے۔ ذرا دیر بعد مرزا صاحب نے شیش ناگ کی طرح دائیں بائیں جھومنا شروع کیا۔ قوالی کی لے تیز ہوتی گئی۔ بابر ڈھولکی بجا رہا تھا۔ اب مرزا صاحب نے رنگ پکڑا۔ سرخ سرخ آنکھیں اُبل آئیں۔ ایک زوردار "ہونہہ" کے ساتھ ڈھولکی کی تال تیز کرنے کا اشارہ کیا۔ اگلے مرحلے میں ڈھولکی چھین کر میری طرف کر دی اور گھڑا بابر کے آگے کھسکا دیا۔ دونوں نے حکم کی تعمیل کی۔ پھر مرزا صاحب نے ایک دوہتڑ مار کر گھڑا

توڑ دیا اور ساتھ ہی ایک اور ''ہونہہ''۔ وہ غریب ایک بڑا سا ٹھیکرا سنبھال کر اس پر ہاتھ مارتا رہا۔ جب وہ ٹوٹ گیا تو اس سے چھوٹا ٹھیکرا پکڑ لیا۔ بھلا ٹھیکروں سے آواز کیا نکلتی۔ اس قصور پر وہ بے قصور زیرِ عتاب آتا۔ یہ اس کی ہمت تھی کہ مار کھاتا اور ہاتھ چلاتا رہا۔ سب لوگ خوفزدہ ہونے کا مظاہرہ کر رہے تھے مگر فضیلت صاحب سے ہنسی ضبط نہ ہو پا رہی تھی۔ ایک جھانپڑ ان کے بھی پڑا تب انھیں اپنے خندۂ بے جا کا احساس ہوا۔ گیلری میں گھر کی خواتین دوپٹے منہ میں ٹھونسے مرزا صاحب کا حال اور بابر کی بدحالی دیکھ رہی تھیں۔ آخر جب سب ٹھیکرے چُور چُور ہو گئے اور ان کی کوریں لگ لگ کر ''معمول'' کے ہاتھوں سے خون رسنے لگا تب کہیں جا کر یہ ناٹک اختتام کو پہنچا۔ مرزا صاحب بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ سب نے سکھ کا سانس لیا۔ مرزا صاحب کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار کر ہوش میں لایا گیا۔ پھر چائے کا دور چلا اور محفل برخاست ہوئی۔

لسانی فسادات کے بعد مرزا صاحب کا خاندان نقل مکانی کر کے کراچی چلا گیا۔ نئی جگہ سے مطابقت پیدا کرنا یوں بھی دُشوار ہوتا ہے۔ مرزا صاحب کا دل وہاں کیا لگتا۔ گاؤں میں انھیں تنگیِ جا کا گلہ تھا اور کراچی میں اضطرابِ دریا کا شکوہ۔ ۱۹۷۶ء میں آخری بار ہم لوگ جلو بھائی کی شادی کی تقریب سے یکجا ہوئے۔ برات کوئٹہ گئی تھی۔ وہ لوگ بولان میل کے ذریعے کراچی سے آئے۔ ہم لاڑکانہ سے سوار ہوئے۔ اس دوران میں مرزا صاحب حسبِ سابق چہکنے کی کوشش کرتے لیکن اس چہکار پر افسردگی کی پرچھائیں صاف محسوس ہوتی تھی۔ کوئٹہ سے واپسی پر گاڑی سبی جنکشن پر رکی تو مرزا صاحب کے سینے میں سخت درد اُٹھا۔ حالت غیر ہو گئی۔ سارا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ ذرا دیر بعد درد رک گیا لیکن وہ نڈھال ہو گئے۔ اس وقت تک دل کے دورے کے بارے میں شعور عام نہیں ہوا تھا اس لیے کوئی بھی اس کی اہمیت نہیں سمجھ پایا۔ کراچی پہنچ کر وہ اپنے معمولات میں مصروف ہو گئے اور علاج پر کوئی توجہ نہ دی۔ ممکن ہے بعد میں بھی

انھیں یہ درد اُٹھا ہوتا ہم انھوں نے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ آخر جب معاملہ بہت بڑھ گیا تو انھیں ۱۳-اگست ۱۹۷۷ء کو عباسی شہید ہسپتال میں داخل کیا گیا جہاں پانچ روز زیر علاج رہنے کے بعد ۱۸-اگست مطابق ۳-رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ بروز جمعرات انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا:

جب خُلد کو راہی ہوئے احمد مرزا   گویا کہ چمن بولتا خاموش ہوا
جس نے بھی سُنا کہا کہ "انا للہ" ۱۱۷   "واحسرتا' وامصیبتا' واویلا"
۱۱۷ + ۱۲۸۰ = ۱۳۹۷

بزرگوں سے سُنا ہے کہ جمعرات کو وفات پانے والے اہلِ ایمان' اللہ کے مقبول بندے ہوتے ہیں۔ مولانا رسول خان مرحوم تو فرمایا کرتے تھے کہ اگر ان لوگوں کے درجات کا دنیا والوں کو علم ہو جائے تو وہ ان کے ورثاء کو مبارکباد دیا کریں۔

مرزا صاحب جیسے بے غرض، صاف دل اور خوش باش انسان بڑے کمیاب ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ لطف و کرم کا معاملہ کیا ہوگا۔

-----◆○◆-----

دیّا کہاں گئے وے لوگوا!

مظاہرِ فطرت میں پہاڑ مجھے بہت لبھاتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ علاقہ کوہستانی ہو۔ ایسا میدانی علاقہ جہاں سے پہاڑ نظر آتے ہوں میرے ذوق کی تسکین کے لیے کافی ہوتا ہے۔ انسانی کاموں میں ایسی پرانی عمارتیں میری کمزوری ہیں جن کا چونے کا پلستر مرورِ ایام سے سیاہ پڑ چکا ہو۔ یہ بڑی پُراسرار ہوتی ہیں۔ ان دونوں چاہتوں کے ریشے میرے بچپن کی یادوں میں پیوست ہیں جو راجپوتانہ میں گزرا، جہاں یہ دونوں چیزیں کثرت سے ملتی ہیں۔ ہر آنے والی برسات میں پہاڑ سرسبز ہو جاتے تھے اور پتھر چونے کی عمارتیں کچھ اور سیاہ پڑ جاتی تھیں۔

۱۹۵۲ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد میں نے اور میرے عزیز دوست چودھری محمد سعید (آف چک نمبر ۷۱ حال ایڈووکیٹ شیخوپورہ) نے لاہور جا کر کالج میں داخلہ لیا۔ ہم ہاسٹل میں رہتے تھے۔ ایک دن باتوں باتوں میں، مَیں نے ان سے اپنی اس محرومی کا ذکر کیا کہ وسطی پنجاب میں پہاڑ دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ ’’ہمارا آبائی علاقہ ضلع سیالکوٹ کی شمال مغربی سرحد کے قریب ہے۔ وہاں سے جموں کشمیر کے پہاڑ نظر آتے ہیں۔ اس نواح میں ہماری قریبی عزیزداریاں ہیں اور میرا ننھیال بھی وہیں ہے بلکہ میں نے اپنی ابتدائی تعلیم بھی وہیں رہ کر حاصل کی ہے۔ اب بھی دونوں طرف سے آر جار لگی رہتی ہے۔ آئندہ ادھر جاتے ہوئے مَیں تمھیں ساتھ لے چلوں گا۔‘‘

دسمبر کی چھٹیوں میں ہم دونوں بذریعہ بس لاہور سے سیالکوٹ روانہ ہوئے۔ ڈسکہ سے آگے نکلے تو سعید صاحب نے مجھے متوجہ کر کے شمالی اُفق کی طرف اشارہ کیا جہاں پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ میں اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ ان دنوں فضائی آلودگی بہت کم ہوتی تھی اس لیے خاصی دُور سے بلند و بالا چیزیں نظر آ جاتی تھیں۔ عصر کے وقت سیالکوٹ پہنچے۔ ایمیلیا ہوٹل کی چائے نے بڑا لطف دیا۔ قریب ہی تانگوں کا اڈہ تھا جہاں سے کوٹلی لوہاراں کے لیے تانگے ملتے تھے۔ ابھی ہیڈ مرالہ جانے والی سڑک نہیں بنی تھی اس لیے تانگہ چھاؤنی کی حدود سے گزر کر ایک نالے کا پُل پار کرنے کے بعد بائیں ہاتھ ایک پتلی سی سڑک پر مڑ گیا۔ ہم بتدریج پہاڑوں سے نزدیک ہو رہے تھے۔ غروب سے کوئی ایک گھنٹہ پہلے ہم کوٹلی لوہاراں (مشرقی) پہنچ گئے۔ یہاں ایک اور خوش گوار حیرت میری منتظر تھی۔ قصبے کے اکثر مکانات کائی زدہ اور سیاہ پوش تھے۔ اس کا سبب قدامت کے علاوہ کثرتِ باراں بھی تھی۔ پہاڑوں کی ترائی میں ہونے کے باعث ان علاقوں میں وسطی پنجاب کے مقابلے میں زیادہ بارشیں ہوتی ہیں۔ میں نے کوٹلی لوہاراں کا نام بچپن ہی سے سُن رکھا تھا۔ دادا جان کے عزیز دوست اور اسلامیہ کالج (لاہور) کے ساتھی پرَوفیسر ایم۔ ایف قریشی یہیں کے رہنے والے تھے۔ جب بھی لاہور سے کسی تقریب میں یہاں آتے تو واپسی پر کوئی دیہی سوغات بالخصوص پونڈے گنّے لایا کرتے تھے۔ کوٹلی کے باشندے اپنی تر دماغی اور چابک دستی کے لیے زمانۂ قدیم سے معروف رہے ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جب معاشی خوشحالی کے لیے وطن چھوڑ کر دوسرے ممالک میں جانے کا کوئی تصور نہ تھا، یہ لوگ مشرقِ وسطیٰ، یورپ اور افریقہ تک پہنچتے تھے۔ یہ علاقہ ہی مردم خیز نہیں' یہاں کی زمینیں بھی نہایت زرخیز ہیں اس لیے بھرپور فصلیں ہوتی ہیں اور باغات کی کثرت ہے۔

آفتاب اپنا سفر پورا کر رہا تھا۔ یہ وقت دل پر ایک خاص اثر کرتا ہے' جیسے کسی

عزیز ہستی کا دم واپسیں ہو۔ ہم کوٹلی لوہاراں سے شمال کی سمت پیدل چل پڑے۔ کوئی میل بھر کھیتوں کی مینڈوں اور پگڈنڈیوں پر چلنے کے بعد ایک چھوٹے سے گاؤں کوٹلی چندو پہنچے۔ زیادہ تر کچے مکان تھے۔ ایک احاطے میں داخل ہوئے جس میں چاروں طرف کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ ایک کمرے میں دو بزرگ شخص سفید کپڑوں میں ملبوس، کھیس لپیٹے، دو چارپائیوں پر تکیوں کے سہارے نیم دراز تھے۔ بیچ میں حقہ رکھا تھا۔ یہ سعید صاحب کے ماموں تھے۔ انھیں دیکھ کر مجھے ایک انگریزی نظم کی یہ دو سطریں یاد آ گئیں:

Old age serene and bright.

And cold as a Lapland night.

سعید صاحب کے سلام کی آواز سے دونوں بزرگ کھل اٹھے۔ ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرا۔ بڑے ماموں نور دین گاؤں کے نمبردار تھے۔ درمیانی ڈاڑھی، ہلکا گندمی رنگ، چہرے پر متانت لیکن سراپا شفقت، ستر کے پیٹے میں ہوں گے۔ ذرا اونچا سنتے تھے شاید اس لیے کم بولتے تھے۔ ان کے بڑے فرزند بھائی فقیر حسین سے جو سعید صاحب کے بہنوئی بھی تھے، میری چک نمبر ۱۷ میں ملاقات ہو چکی تھی۔ چھوٹے ماموں احمد دین جنھوں نے ڈاڑھی نہیں رکھی ہوئی تھی ملنسار اور منکسر مزاج تھے۔ گفتگو تیز تیز کرتے تھے۔ دونوں کی اولادیں جوان تھیں اور کاشتکاری کا سارا بوجھ انھوں نے اٹھا لیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے ملنے ملانے والوں کا جمگھٹا ہو گیا۔ دونوں بزرگ تو کوئی دس بجے سونے کے لیے اٹھ گئے لیکن محفل آدھی رات تک جمی رہی۔ حقے تازہ ہوتے رہے اور چائے کا دور چلتا رہا۔ گاؤں اور اردگرد کے چھوٹے چھوٹے مزاحیہ واقعات زیر بحث رہے۔ ہمارے ہم سنوں میں محمد رمضان عرف جان کو لوگوں کی نقلیں اتارنے میں مہارت حاصل تھی لیکن اور سب سے قطع نظر اس مجلس میں دو اشخاص جن کی

عمریں تیس پینتیس برس کے درمیان ہوں گی زیادہ نمایاں تھے۔ ایک تو حسن دین جو سعید صاحب کے عزیزوں ہی میں تھے اور دوسرے محمد شفیع جن کا تعلق میر عالم برادری سے تھا۔ اول الذکر کو عملی مذاق کرنے اور معمول کے واقعات کو مزاح کا رنگ دینے میں کمال حاصل تھا۔ باتیں ذرا رک رک کر کرتے تھے اور لہجے میں امریکنوں کی طرح ہلکی سی غناہٹ تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں واقعات کی تصویر کشی میں مزاحم ہونے کی بجائے معاون ثابت ہوتی تھیں۔ رہے محمد شفیع تو وہ تھے ہی بولتی ہڈی۔ ۱۹۴۷ء میں جموں کے علاقے سے اکھڑ کر آئے تھے۔ اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد اس بستی میں پہنچے تو مہر نور دین نمبردار کے سایۂ عاطفت میں قرار پایا۔ پھر تو ایسے جمے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ تعلیم سے بے بہرہ ہونے کے باوجود ایسی لچھے دار گفتگو کرتے کہ انجان شخص کو ان کے اَن پڑھ ہونے کا شک بھی نہ گزرتا۔ باتوں میں اشاروں کنایوں سے خوب کام لیتے اور ان اشاروں میں عبارتیں پنہاں ہوتی تھیں۔ مختصر یہ کہ دونوں صاحبان فنِ مجلس آرائی کے بادشاہ تھے۔

علی الصبح اٹھ کر میں اور سعید صاحب گاؤں سے شمال کی سمت نکل گئے۔ ایک ایسی جگہ پہنچ کر جہاں درختوں کی اوٹ نہ تھی ہم بیٹھ گئے۔ میں نے پہاڑی سلسلے کا جائزہ لیا۔ پہلے نیچی پہاڑیوں کی ایک قطار تھی۔ اس کے پیچھے کچھ اونچے پہاڑ جن پر موسم سرما کی پہلی برفباری کے آثار موجود تھے۔ ان کے عقب میں پیر پنجال کا بلند سلسلۂ کوہ تھا جو وادیٔ کشمیر کی جنوبی حد فاصل ہے۔ یہ سرتاسر برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ ذرا دائیں جانب جہاں یہ زنجیر منقطع ہوتی تھی، ایک خلا تھا۔ اس کے بعد، گویا عین مشرق کی سمت میں، ایک تنہا برف پوش پہاڑ بڑی شان سے سر اٹھائے کھڑا تھا۔ میں نے اس کے محل وقوع سے اندازہ لگایا کہ یہ دھولا دھار ہے جس کے قدموں میں دھرم سالہ آباد ہے۔ بعد میں لاہور واپس آ کر میں نے نقشہ دیکھا تو میرے قیاس کی تصدیق ہو گئی۔

یہ ماحول اور ان سیدھے سادے، محنتی اور قناعت پسند لوگوں کی اپنائیت اور زندہ دلی مجھے بہت بھائی۔ ہم تین دن ٹھہر کر واپس آئے۔ سعید صاحب کو بھی میری اس پسندیدگی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد، جب بھی ان کا کسی تقریب سے ادھر جانا ہوتا، وہ مجھے بھی ساتھ لے لیتے۔ وقفہ طویل ہو جاتا تو محض تفریحاً بھی چکر لگا لیتے۔

اصل محفل رات ہی کو جمتی تھی جب سب لوگ کام کاج سے فارغ ہو کر یکجا ہوتے۔ دن کو ہم اِدھر اُدھر گھومتے۔ بھائی فقیر حسین کے پاس کنویں پر چلے جاتے اور موسم کے مطابق پیڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں یا دھوپ میں چارپائیوں پر ستاتے۔ ایسے موقعوں پر میں اپنا رُخ شمالی پہاڑوں کی طرف رکھنا کبھی نہ بھولتا تھا۔

دو آدمیوں کی صحبت ہمیں اکثر دن کو بھی میسر رہتی تھی۔ ایک تو چھوٹے ماموں اور دوسرے محمد شفیع۔ ان کی باتیں بڑی دلچسپ اور معلومات افزا ہوتی تھیں۔ شفیع کو کلاسیکی اور نیم کلاسیکی موسیقی سے فطری لگاؤ تھا۔ اسی مناسبت سے ایک ٹرانزسٹر ریڈیو اس کی ضروریاتِ زندگی میں شامل رہتا۔ گن رسیا میں بھی ہوں چنانچہ اس موضوع پر اکثر طویل گفتگو ہوتی۔ وہ اس فن سے میری دلچسپی دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔ مجھے بھی کئی نئی باتیں معلوم ہوتیں۔

ریڈیو پاکستان ڈھاکہ سے منسلک ایک کلاسیکی گویّے تھے مستان گاما۔ ریڈیو کے پندرہ روزہ رسالے ''آہنگ'' میں ان کا فوٹو چھپا تھا۔ پکا رنگ، سفید کُتر واں ڈاڑھی، درویشانہ وضع قطع، موسیقی کے نشے میں غرق معلوم ہوتے تھے گویا اسم بامسمیٰ تھے۔ ان کی وفات ڈھاکا میں سڑک کے ایک حادثے میں ہوئی تھی۔ میں انھیں مشرقی پاکستان کا باشندہ سمجھتا تھا۔ محمد شفیع نے یہ انکشاف کیا کہ مرحوم کوٹلی لوہاراں کے رہنے والے تھے۔ سال دو سال میں جب کبھی کوٹلی آتے تو شفیع اور چھوٹے ماموں جان ان کے پاس پہنچ جاتے۔ مستان گاما ان کو ساتھ لے کر آبادی سے باہر درختوں کے جھنڈ میں

جا بیٹھتے اور پہروں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ بقول محمد شفیع ایک بار ٹوڑی کی اتنی قسمیں بتائیں اور گاگا کران کا فرق اس صراحت و مہارت سے دکھایا کہ ہم عش عش کر اُٹھے۔

استاد اللہ دتا بہاری ریڈیو پاکستان کراچی کے مایۂ ناز طبلہ نواز تھے۔ ان کی شخصیت بڑی متاثر کن تھی۔ ایک مرتبہ باغ جناح لاہور کے اوپن ائیر تھیٹر میں سالانہ محفلِ موسیقی ہو رہی تھی۔ اسٹیج کے عقبی دروازے سے ایک صاحب آئے اور بائیں جانب پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔ شیروانی میں ملبوس، گندمی رنگ، سر پر سفید بال بڑے قرینے سے جمے ہوئے۔ میں نے محترم احمد ندیم قاسمی صاحب سے کہا ''آج تو ذوالفقار علی بخاری صاحب بھی آئے ہیں۔'' پہلی نظر میں وہ بھی نہ پہچان سکے اور فرمایا ''جی ہاں'' پھر غور سے دیکھ کر بولے ''مظہر بھائی! یہ بخاری صاحب نہیں ہیں۔ یہ ایک مشہور طبلہ نواز ہیں۔ نام بھول رہا ہوں۔'' میں نے عرض کیا ''اللہ دتا بہاری۔'' فرمایا ''جی، وہی ہیں۔'' میں ان کے پنجابی نام کے ساتھ بہاری نسبت سے مخمصے میں رہتا تھا۔ محمد شفیع نے بتایا کہ استاد کا تعلق کوٹلی کے ایک نواحی گاؤں بہاری پور سے ہے۔

برسوں تک میں یہ سمجھتا رہا کہ محمد شفیع کو موسیقی کا محض نظری علم ہے۔ ایک بار گرمی کی چھٹیوں میں، مَیں اور سعید صاحب گئے۔ گھنگور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ کوٹلی لوہاراں سے نکلے تو ترشح ہونے لگا۔ ہم بھیگتے بھاگتے منزل پر پہنچے۔ گاؤں میں داخل ہوئے تو ملہار کے سُروں کی آواز کان میں پڑی۔ گویّوں کی ایک جوڑی نہایت پختہ اور سریلی آوازوں میں راگ کا الاپ کر رہی تھی۔ میرے پاؤں جکڑ گئے۔ سعید صاحب نے رک کر پوچھا ''کیوں! خیر تو ہے؟'' میں نے جواب دیا ''ہاں خیر ہے لیکن اس وقت یہ راگ کون سے ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہو رہا ہے؟'' سعید صاحب ہنس کر بولے ''کیسا ریڈیو اسٹیشن؟ یہ تو محمد شفیع اور اس کا لڑکا مرید حسین ہیں۔'' میں بڑا حیران ہوا۔ شام کو ملاقات ہوئی تو میں نے کہا ''آپ تو چھپے رستم ہیں۔ کسی دن ہمیں بھی کچھ سنائیں۔''

ہنس پڑا اور شرمندہ سا ہو کر بولا ''بس یونہی موسم دیکھ کر ترنگ میں آ گئے تھے ورنہ کہاں ہم اور کہاں یہ فنِ شریف۔''

محمد شفیع کو معاش کے لیے خاصے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ بال بچوں کا ساتھ تھا۔ زمین کا کوئی ٹکڑا ٹھیکے یا حصے پر لے لیتا جس سے کچھ غلّہ حاصل ہو جاتا تھا۔ ایک آدھ جانور رکھ لیتا اور اسے پال پوس کر فروخت کر دیتا۔ لیکن کاشت کاری کی صعوبت اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ ایک تو امیر قوم، اچھا کھانا اچھا پہننا، پھر یہ آرام طلبی اور بھاری بھرکم جسم۔ آخر نمبردار صاحب نے دائرے کی خدمت سپرد کر دی لیکن کھینچ تان کر ہی گزارا ہوتا تھا۔ نور بی بی لڑتی رہتی۔ ادھر بچے بڑے ہو رہے تھے اور اخراجات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جہاں چاہ وہاں راہ اور بالآخر اس نے یہ راہ ڈھونڈ نکالی۔ میں اس شخص کی ہمت کی داد دیتا ہوں کہ اس ڈھلتی عمر میں اس نے حروفِ تہجی سے شناسائی حاصل کی اور تھوڑے ہی عرصے میں اُردو کی کتابیں روانی سے پڑھنے لگا۔ لسّان اور سُریلا تو تھا ہی' محرم کی مجلسیں پڑھنے کا آغاز کیا۔ پہلے گردونواح میں اور پھر خاصے دور تک کے علاقوں میں مقبول ہو گیا۔ اچھا معاوضہ ملتا اور خاطر تواضع بھی ہوتی، عزت و توقیر اس پر مستزاد۔ یکم محرم سے لے کر چہلم تک کا سوا مہینہ خوب مصروف رہتا۔ قدردانوں کا ذاکر صاحب، ذاکر صاحب کہتے منہ سوکھتا تھا۔ بایں ہمہ گاؤں والوں کے ساتھ اس کے تعلقات سابقہ وضع پر قائم رہے اور میرے ساتھ بھی اس کی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہم لوگ محرم کے مہینے میں وہاں جانے سے گریز کرتے تھے کیونکہ ان دنوں وہ گاؤں سے غیر حاضر ہوتا تھا اور ہماری راتوں کی محفلیں ادھوری رہتی تھیں۔

ان شبینہ محفلوں میں محمد شفیع کے مدِ مقابل مہر حسن دین ہوا کرتے تھے بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ دونوں ایک دوسرے کے مستقل حریف تھے۔ یوں بھی دونوں کی شخصیات میں بُعد المشر قین تھا۔ شفیع سیاہ فام حسن دین گورے چٹے، وہ بھاری بھرکم یہ

چھریرے بدن کے، وہ کاہل الوجود یہ تیز طرّار، وہ پہلو دار بات کرنے کا عادی یہ سیدھی چوٹ لگانے والے، اس کی جسمانی مشقت سے جان جاتی تھی یہاں بچپن سے لے کر آخری دم تک محنت سے سروکار رہا۔ غرض دونوں میں بھینسے اور دھنّی کے بیل کا سا فرق تھا۔ دونوں میں نوک جھونک رہتی اور عملی مذاق کے مقابلے بھی ہوتے۔ ان میں پہل عموماً حسن دین کی طرف سے ہوتی اور پلّہ بھی اکثر اسی کا بھاری رہتا۔ ظالم ایسا تر دماغ تھا کہ قولاً یا فعلاً کسی موقع پر چُوکتا نہ تھا۔ ایک دن محمد شفیع کوٹلی سے گھر آ رہا تھا۔ ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چھڑی تھی۔ راستے میں حسن دین کوٹلی جاتا ہوا ملا۔ شفیع نے لاڈ میں آ کر ہلکی سی چھڑی رسید کی اور پوچھا ''کدھر جا رہے ہو؟'' جواب ملا ''پولیس چوکی۔''

''کیوں؟'' شفیع نے استعجاب کے ساتھ دریافت کیا۔

''تم نے مارا جو ہے۔''

سردیوں کی ایک رات دیر گئے جب حسن دین اپنی حویلی میں مویشیوں کو چارہ ڈالنے گیا تو وہاں ایک مریل سا آوارہ گدھا کھڑا دیکھا۔ حسن دین نے اس کے گلے میں رسّی ڈالی اور سیدھا محمد شفیع کے گھر پہنچ گیا۔ اہلِ خانہ اندر خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ صحن میں پلی ہوئی کٹڑی بندھی تھی۔ حسن دین نے اس کی جگہ گدھے کو باندھا، کٹڑی کو کھول کر گھر لے گیا اور ایک کوٹھڑی میں باندھ کر چارہ ڈال دیا۔ پچھلی رات کو نور بی بی اندر سے نکلی تو نیم تاریکی میں چھپر کے نیچے دراز گوش نظر پڑا۔ گھبرا کر شفیع کو اٹھایا۔ دونوں نے لالٹین جلا کر دیکھا۔ بیوی نے پریشانی کے عالم میں پوچھا ''ہماری کٹڑی کون لے گیا؟'' شفیع نے نہایت اطمینان سے کہا ''نیک بخت! کٹڑی وہی لے گیا جو یہ تحفہ دے گیا ہے۔'' علی الصبح حسن دین کی حویلی میں جا کو ٹوہ لگائی۔ وہاں کٹڑی ہوتی تو ملتی۔ سارے گاؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ سب کو یقین تھا کہ یہ حسن دین کی کارروائی ہے۔ آخر شام کو یہ ڈرامہ اختتام کو پہنچا البتہ اس کے مختلف پہلوؤں پر کئی دن

تک تبصرے ہوتے رہے۔

ایک دن دو قصاب گوشت کے لیے جانور خریدنے کی غرض سے بستی میں آئے۔ ان کی مڈبھیڑ حسن دین سے ہوگئی۔ اس نے ان سے کہا ''ایک کٹڑوا، خوب پلا پلایا، تمھارے مطلب کا محمد شفیع کے گھر ہے۔ ڈیڑھ پونے دو من گوشت آرام سے نکل آئے گا۔ انھیں پیسوں کی ضرورت بھی ہے لیکن نور بی بی نے اسے بڑے چاؤ سے پالا ہے۔ وہ آسانی سے نہیں بیچنے کی۔ تم اصرار کرو گے تو مان جائے گی لیکن میرا نام نہ لینا۔'' لطف یہ ہے کہ اُن دنوں شفیع کے پاس کوئی جانور سرے سے تھا ہی نہیں۔ قصاب شفیع کے گھر پہنچ گئے۔ نور بی بی نظر پڑی۔ کہنے لگے ''بہن! اگر کٹڑوا بیچنا ہے تو ہم اچھی قیمت دے دیں گے۔''

وہ بولی ''بھائی، ہمارے ہاں تو کوئی کٹڑا نہیں ہے۔'' قصاب سمجھے کہ واقعی یہ بیچنا نہیں چاہتی۔ بولے ''تم دکھاؤ تو سہی، ہم پیسے لگا دیں گے، مرضی ہو تو دے دینا ورنہ کوئی زبردستی تو ہے نہیں۔'' شفیع اندر کمرے میں چارپائی پر لیٹا حقہ پی رہا تھا۔ باہر یہ ردوکد سنی تو سارا قصہ سمجھ گیا۔ باہر نکل کر قصابوں سے مخاطب ہوا ''بھائیو! میں ہی وہ کٹڑوا ہوں جس کو خریدنے کے لیے حسن دین نے تمھیں بھیجا ہے۔ اب جلدی سے دام لگا دو' اگر مناسب ہوئے تو تمھارے ساتھ چل پڑوں گا۔'' قصاب شرمندہ ہو کر چل دیے۔

میرے متعارف ہونے کے بعد اسی زندہ دلی اور خوش وقتی میں پندرہ برس کا عرصہ گزر گیا۔ بڑے ماموں بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ ستمبر ۱۹۶۸ء کے اوائل میں بخار نے آلیا اور ۸- ستمبر کو عصر کے وقت انھوں نے سفر آخرت اختیار کیا۔ دونوں بھائیوں کی مثالی محبت نے یہاں بھی اپنا جلوہ دکھایا۔ وفات سے ذرا پہلے انھوں نے چھوٹے بھائی کو بلوایا۔ وہ ذرا دیر کو کنویں پر گئے تھے۔ واپس آتے ہوئے پیغام پہنچانے والا ملا اور کہا کہ ''لالہ کا چل چلاؤ ہے۔ تمھیں یاد کر رہے ہیں۔'' بس یہ سنتے ہی گر پڑے۔ اٹھا کر گھر

لایا گیا۔ پھر ہوش نہ آسکا اور اسی رات کے پچھلے پہر وہ بھی اپنے برادر عزیز سے جا ملے:

وہ چلے چھڑا کے دامن مرے دستِ ناتواں سے

اسی دن کا آسرا تھا مجھے مرگِ ناگہاں سے

اگلے دن دونوں بھائیوں کو پہلو بہ پہلو لحد کے سپرد کر دیا گیا۔ ایسی شفیق ہستیوں کا سایہ یوں بیک وقت سر سے اٹھ جانا بڑا جانکاہ صدمہ تھا۔ اب زمامِ کار اگلی نسل کے ہاتھ میں آئی۔ بھائی فقیر حسین نمبردار مقرر ہوئے۔ مجھ سے ان کی پُرخلوص محبت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ باقی افراد سے بھی مخلصانہ تعلقات بدستور قائم رہے۔ ہمارا آنا جانا جاری رہا۔ چہل پہل عود کر آئی۔ اب حسن دین نے کھل کر اپنے جوہر دکھانے شروع کیے۔ بڑوں کی طرف سے جو باز پرس کا خدشہ تھا وہ بھی جاتا رہا۔ ہم جب بھی جاتے وہ اپنی تازہ فتوحات کے واقعات تفصیل کے ساتھ سناتا۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے لیکن وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ داستان سرائی میں مصروف رہتا۔

انھی دنوں اس کا محمد شفیع سے فیصلہ کن معرکہ ہوا جس کا حال اس نے مزے لے لے کر ہمیں سنایا۔ دراصل پہل شفیع کی طرف سے ہوئی تھی۔ ایک دن شام کے وقت وہ کوٹلی سے آ رہا تھا۔ گاؤں کے قریب حسن دین ملا۔ شفیع نے بڑی سنجیدہ صورت بنا کر کہا ''حسن دین! تمھاری جو بہن کوٹلی میں رہتی ہے وہ کوٹھے پر سے گر پڑی ہے۔ ہسپتال لے جا رہے تھے۔ میں ادھر ہی سے آ رہا ہوں۔'' حسن دین وہیں سے کوٹلی کی طرف چل پڑا۔ بہن کے گھر پہنچا تو وہ شام کا کھانا تیار کر رہی تھی۔ پوچھا ''بھائی! کیسے آئے ہو، خیریت تو ہے؟'' جواب دیا ''ہاں سب خیریت ہے، بس ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا تمھیں دیکھتا چلوں۔'' بات آئی گئی ہوئی۔ مجال ہے جو حسن دین نے کسی سے اس بات کا تذکرہ کیا ہو۔ چھ ماہ گزر گئے۔ چند میل دور شیر پور نامی گاؤں میں شفیع کی ایک بھانجی بیاہی ہوئی تھی۔ اسے تپ محرقہ ہو گیا اور بیماری نے طول کھینچا۔ شفیع ایک دن بیچ

اس کی خبر گیری کو جاتا تھا۔ ایک روز وہ ادھر گیا ہوا تھا۔ حسن دین کے کھیت کے برابر سے ایک کچا راستہ اگلے دیہات کو جاتا تھا۔ عصر کے وقت ادھر سے ایک راہگیر گزرا تو حسن دین نے اسے روک کر کہا ''بھائی! ایک مہربانی کرو۔ یہ سامنے کوٹلی چندو کا گاؤں ہے۔ محمد شفیع کے گھر یہ پیغام دے دینا کہ اس کی شیر پور والی بھانجی، جو بیمار تھی، فوت ہو گئی ہے۔ مجھے کئی جگہوں پر یہ اطلاع پہچانی ہے۔ میرا وقت بچ جائے گا۔'' وہ بھلا آدمی مان گیا اور خبر پہنچا دی۔ نور بی بی نے بعض پڑوسنوں کو ساتھ لیا اور روتی پیٹتی شیر پور کو روانہ ہوئی۔ راستے میں پڑنے والے دیہات سے اور خواتین ساتھ ملتی گئیں اور جتھے کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ادھر لڑکی کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ شفیع شیر پور سے ایک اور گاؤں کی طرف نکل گیا۔ گھر لوٹتے ہوئے اسے دور سے یہ قافلہ شیر پور کی طرف رواں دواں نظر آیا۔ آواز تو پہنچ نہیں سکتی تھی۔ واپس لوٹنے کے بہت اشارے کیے لیکن وہاں کون سنتا تھا۔ نور بی بی نے سینے پر دوہتڑ مار کر کہا ''ہائے یہ خدائی خوار جانے کہاں سے آ رہا ہے۔ ہم برباد ہو گئے اور اس کو کچھ خبر نہیں۔'' برسات کا موسم تھا۔ کھیتوں کی گیلی مینڈوں پر پھسلتے پھسلاتے، کیچڑ پانی میں لت پت، یہ جلوس سیاپا کرتا ہوا شیر پور میں داخل ہوا۔ وہاں تو جو گزری سو گزری، یہاں شفیع سیدھا حسن دین کے پاس پہنچا اور ہاتھ جوڑ کر بولا ''حسن دین! غلطی میری ہی تھی۔ تم جیتے میں ہارا۔ آئندہ ایسا تکلیف دہ مذاق نہ میں کروں گا نہ تم کرنا۔''

سچ پوچھیے تو محمد شفیع، حسن دین کے بائیں ہاتھ کی مار تھا۔ ان حضرت کی طبعِ رسا اور دستِ چابک سے کوئی بھی بچ کر نہ نکل سکتا تھا۔ ایک بار وہاں سے چند آدمی ایک شادی میں شرکت کے لیے شیخوپورہ آئے۔ ان میں حسن دین بھی تھا۔ واپسی کے وقت میزبانوں نے حسبِ دستور ان لوگوں کو لڈو دیے۔ اَوروں نے تو یہ لڈو راستے میں کھا لیے لیکن ایک بڑے میاں نے انھیں اپنی چادر کے پلو میں باندھ لیا۔ حسن دین نے

موقع پا کر بڑی چابک دستی سے لڈو کھولے اور ان کی جگہ مٹی کے ڈھیلے باندھ دیے۔ شام کو گاؤں پہنچے تو بڑے میاں نے گھر میں قدم رکھتے ہی پوتوں پوتیوں کو بلایا اور بڑے اشتیاق سے پوٹلی کھولی۔ ادھر حسن دین بھی تماشا دیکھنے کی غرض سے اپنے گھر سے حقے کی چلم اٹھا آگ رکھنے کے بہانے پہنچ گیا۔ لڈوؤں کی جگہ ڈھیلے دیکھ کر بڑے میاں ہکا بکا رہ گئے۔ حسن دین نے اس کی توجیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ "کلجگ کی نشانی ہے۔ سنا ہے اگلے زمانے میں جنات کی دی ہوئی مٹھائی کوئلوں میں بدل جاتی تھی۔ اب انسانوں کی دی ہوئی مٹھائی مٹی کے ڈھیلے بننے لگی ہے۔" اور بڑے میاں کو اس کی بات کی تائید کرتے ہی بنی۔ بعد میں جب خود حسن دین نے یہ قصہ مجھے سنایا تو صراحت کرتے ہوئے کہا کہ میرا موقع پر پہنچنا محض صورتِ حال سے لطف اندوز ہونے کے لیے نہیں تھا بلکہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ میری موجودگی میں بڑے میاں مجھے قصوروار نہیں ٹھہرائیں گے۔ بصورت دیگر شہر میں اونٹ بدنام کے مصداق الزام سیدھا مجھ پر آئے گا۔

حسن دین لڑکپن ہی سے فکرِ معاش کے جھمیلوں میں پڑ گیا تھا۔ شادی بھی نوعمری میں ہوگئی۔ اوپر تلے چھ بچے ہوئے جن میں تین بیٹے یعقوب، یوسف اور یونس تھے۔ ابھی بتیس تینتیس برس کا تھا کہ بیوی داغِ مفارقت دے گئی۔ اس نے باپ ہی نہیں ماں بن کر بچوں کو پالا اور دوسری شادی کا اس کو کبھی خیال تک نہ آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے باقی طویل عرصۂ عمر نہایت پاکدامنی اور نیک نامی سے بسر کیا۔ اس ایثار کے باعث، میں حسن دین کا دل سے احترام کرتا تھا۔ وہ اَن تھک کارکن تھا۔ فارغ بیٹھنا تو جانتا ہی نہ تھا۔ بیٹے ذرا بڑے ہو کر باپ کا ہاتھ بٹانے کے لائق ہوئے تو اس نے اتنا ہی کام بڑھا لیا۔ اپنی محنت میں مطلق کمی نہیں کی۔ اس مشقت پر یہ زندہ دلی اس کے مثبت کردار کا روشن ثبوت تھا۔ بذلہ سنجی اور نکتہ طرازی اس پر ختم تھی اور انسانی فطرت کا

گہری نظر سے مطالعہ اس کا خاص میدان۔ اپنی بستی اور گردونواح کے ہر فرد کی کمزوریاں اسے مستحضر رہتی تھیں اور مناسب موقعوں پر وہ ان کی طرف اس بے ساختگی سے اشارہ کرتا تھا کہ متعلقہ شخص بغلیں جھانکنے لگتا۔

ایک دن عصر کے وقت ٹہلتے ہوئے ہم لوگ حسن دین کے کھیت پر پہنچے۔ وہ کام چھوڑ کر ہمارے پاس آ بیٹھا۔ اتنے میں صوبیدار منظور، جو فوج سے چھٹی پر آ رہا تھا، گاؤں جاتے ہوئے، سلام دعا کرتا ادھر سے گزرا۔ سیاہ ریش جوان آدمی تھا لیکن متانت عمر سے کہیں زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ یہ غیر متناسب صورتِ حال شاید حسن دین کو ہضم نہ ہو سکی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا ''ہمارا گاؤں یوں تو چھوٹا سا ہے لیکن یہاں بڑی بلند پایہ ہستیاں موجود ہیں۔ یہ صوبیدار صاحب بھی پیدائشی ولی اللہ ہیں۔ لڑکپن ہی میں ان کے ایما پر بے جان چیزیں متحرک ہو جاتی تھیں۔ مجھے ان کی اس کرامات کا محض اتفاقیہ علم ہو گیا تھا۔ کوئی پچیس برس پہلے کا ذکر ہے۔ ایک دن منہ اندھیرے بابا احما مرحوم گھبرایا ہوا میرے پاس آیا اور کہنے لگا: رات ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں تربوزوں کی باڑی میں چارپائی پر لیٹا حقہ پی رہا تھا۔ آدھی رات کا وقت اور مدھم سی چاندنی تھی۔ مجھے اپنی پائنتی ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تربوز بڑے آرام سے کھسکتا ہوا برابر والے گنّے کے کھیت کی طرف جا رہا ہے۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ حقہ چھوڑ منہ پر چادر ڈال کر سو رہا۔ میں نے بابے سے کہا: یہ تو جنّات کی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ تربوز کا پیچھا نہیں کیا۔ بعد میں اپنے طور پر سن گن لی تو یہ ان حضرت کی کارستانی تھی۔ انھوں نے لوہے کے موٹے تار کا ایک آنکڑا بنایا ہوا تھا۔ کماد میں چھپ کر اپنی پسند کا تربوز اس مہارت سے کھینچتے تھے کہ پتہ بھی نہ ہلنے پاتا۔ اب تو ان کے کمالات میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہو گا کیونکہ یہ متشرّع بھی ہو گئے ہیں۔ اتفاق سے اگلے دن گاؤں کے سب لوگ مسجد کی تعمیرِ نو کے لیے مشورے کی خاطر جمع

ہوئے۔ ہر شخص بڑھ چڑھ کر رائے زنی کر رہا تھا لیکن صوبیدار صاحب بالکل خاموش تھے۔ حسن دین نے انھیں مخاطب کر کے کہا ''آپ بھی کچھ فرمائیے یا صرف تربوز چلانے کا ہنر ہی جانتے ہیں۔'' جواب میں وہ صرف مسکرا کر رہ گئے۔

پنجابی میں ایک مشہور کہاوت ہے کہ سانپوں کے آگے دیے نہیں جلا کرتے۔ حسن دین کے منطقی دلائل کے سامنے بھی کسی کی پیش نہیں جاتی تھی۔ مدِ مقابل کے موقف کا بودا پن وہ ایک لمحے میں بھانپ لیتا اور بڑے مسکت انداز سے اس کی معقول تردید کرتا۔ جن دنوں اس کی بیوی مرض الموت میں مبتلا تھی اور وہ اس کی تیمارداری میں مصروف تھا، مویشی گاؤں سے باہر ایک درخت کے نیچے بندھے ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک بڑی بی کی دو بھینسیں بھی بندھی تھیں۔ اس نواح میں مویشیوں کی چوری کم ہی ہوتی ہے لیکن شُدنی امر کہ رات کو بڑی بی کی ایک بھینس کوئی کھول کر لے گیا۔ بڑھیا کو غصہ اس بات کا تھا کہ آخر حسن دین کی بھینس چوری کیوں نہیں ہوئی۔ لہٰذا تھانے جا کر چوری کا الزام اس پر تھوپ دیا۔ تفتیش کے لیے تھانیدار آیا۔ حسن دین نے صحتِ جرم سے انکار کیا۔ تھانیدار نے وہی بڑی بی والی دلیل پیش کی کہ پھر تمھاری بھینس کیوں نہیں گئی؟ حسن دین نے جوابی سوال داغتے ہوئے کہا ''میری بیوی جو بیمار پڑی ہے اور اس کی حالت مخدوش ہے ان بڑی بی سے آدھی عمر کی بھی نہیں ہے۔ آخر وہ بیمار کیوں ہوئی اور یہ بڑھیا کیوں نہیں ہوئی؟'' یہ سن کر تھانیدار ہنس پڑا اور حسن دین کو بے قصور قرار دے کر واپس لوٹ گیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حسن دین نے گاؤں کے ایک شخص اللہ دتا کے ساتھ مل کر کھیتوں میں بہک[۲] بٹھائی ہوئی تھی۔ ایک دن کسی وجہ سے دوپہر کا کھانا دیر میں کھایا اس لیے شام کو بھوک محسوس نہ ہوئی۔ وہ بغیر کچھ کھائے بہک پر چلا گیا۔ وہاں جانوروں کی حفاظت کی خاطر آدھی رات تک حسن دین کو جاگنا تھا اور اس کے بعد صبح تک اللہ دتا

کو۔ جب آدمی رات ہونے کو آئی تو اسے بھوک ستانے لگی۔ اس وقت گھر جا کر کھانا طلب کرنا بے تکی بات تھی۔ اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اللہ دتا کی تازہ بیائی ہوئی بھینس کی کٹڑی کھول دی۔ بھینس نے اسے جھیل لیا۔ حسن دین کا کام بن گیا۔ انصاف سے کام لیتے ہوئے اس نے دو تھن تو کٹڑی کو پلائے۔ پھر اسے باندھ کر دو کی دھاریں خود لیں۔ پیٹ بھرا تو اللہ دتا کو اٹھایا اور خود سو گیا۔ صبح بھینس نے اللہ دتا کو دودھ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ پہلی بار تو حسن دین نے یہ حرکت مجبوری سے کی تھی لیکن پھر اسے معمول بنا لیا۔ ایک وقت کے دودھ سے محروم ہونے پر اللہ دتا کو فکر لاحق ہوئی۔ وہمی آدمی تھا۔ چند میل دور رتّو وال نامی گاؤں میں اپنے پیر صاحب کی خدمت میں پہنچا اور معاملہ گوش گزار کیا۔ پیر صاحب نے فرمایا کہ بھینس کو نظر لگ گئی ہے۔ آٹے کا پیڑا پڑھ کر دیا مگر اس کا کیا اثر ہوتا۔ اللہ دتا ہر چوتھے پانچویں دن پیر صاحب کے پاس جاتا اور تعویذ لاتا لیکن بھینس نے دودھ دینا تھا نہ دیا۔ دو ڈھائی مہینے جب تک بہک رہی یہی حال رہا۔ آخر جانور باڑوں میں واپس گئے تو بھینس نے دونوں وقت دودھ دینا شروع کیا۔

چند ماہ گزرے تھے کہ اللہ دتا کی کنویں کے پاس بندھی بھینس کی زنجیر کوئی کھول کر چلتا بنا۔ اللہ دتا حسب معمول پیر صاحب کے پاس گیا۔ اب خدا جانے انھوں نے جوتی گھمائی یا چھری پھرائی اور ایک نام لے دیا کہ زنجیر اس نام کے آدمی نے چرائی ہے۔ اتفاق سے گاؤں میں ایک شخص اس نام کا تھا۔ اللہ دتا نے پنچایت میں مسئلہ پیش کیا۔ اگلے روز پنچایت کا اجلاس ہوا۔ بستی کے لوگ جمع ہو گئے۔ اللہ دتا نے اس شخص پر چوری کا الزام لگایا۔ اس نے انکار کیا۔ اس سے قبل کہ معاملہ آگے بڑھتا حسن دین نے اللہ دتا کو اپنی طرف متوجہ کیا اور دونوں کے درمیان یہ مکالمہ ہوا:

''تمھیں کس نے بتایا کہ تمھارا چور یہ شخص ہے؟''

''میرے پیر صاحب نے۔''

''کون سے پیر صاحب؟''

''میرے پیر صاحب جو رتّو وال گاؤں میں رہتے ہیں۔''

''تمھیں یاد ہے کہ چند ماہ قبل میں نے اور تم نے مل کر کھیتوں میں بہک بٹھائی تھی؟''

''ہاں یاد ہے۔''

''اور اس بہک کے دوران میں تمھاری بھینس نے صبح کو دودھ دینا بند کر دیا تھا؟''

''یہ ٹھیک ہے۔''

''اور تمھارے انھی پیر صاحب نے کہا تھا کہ بھینس کو نظر ہو گئی ہے۔''

''ہاں یہی بتایا تھا۔''

''پیر صاحب سے پیڑے اور تعویذ لا لا کر تمھاری جوتی بھی گھس گئی تھی لیکن تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ تمھاری بھینس کی وہ مریل کٹڑی جو چلتے ہوئے لڑکھڑاتی تھی اور جسے تم کھرلی میں ڈال کر بہک پر لے گئے تھے، چند ہفتوں میں کیسی موٹی تازی ہو گئی تھی۔ نہ ہی تم نے میری صحت کی بہتری کی طرف دھیان دیا---''

اس کے بعد حسن دین نے حاضرین کو سارا واقعہ سنا کر لوٹ پوٹ کر دیا۔ پھر دلیل دیتے ہوئے کہا کہ جن پیر صاحب کو مسلسل دو ماہ تک ہونے والی چوری کا پتہ نہیں چل سکا، ان کی رائے کو ایسی چوری کے معاملے میں کوئی وقعت نہیں دی جا سکتی جو چند لمحوں میں انجام پا گئی ہو گی۔ غرض پنچایت نے اس بھلے آدمی کو باعزت بری کر دیا۔

حسن دین نے اضافی آمدنی کی خاطر مویشیوں کی خرید و فروخت کا شغل اپنا

رکھا تھا۔ اس شعبے میں بھی اس کی مہارت کا اعتراف ہر شخص کو تھا۔ جب بچے سیانے ہوئے تو اس نے ان کو بھی اس میدان کے گُر سکھا دیے۔ اس ضمن میں اس کی کامیابیوں پر بنی واقعات دلچسپ بھی ہیں اور کثیر بھی لیکن یہ مضمون ان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ ابھی ٹریکٹروں کا رواج نہیں ہوا تھا۔ چند میل دُور ایک گاؤں میں کسی شخص کے پاس ایک بڑا عمدہ بیل تھا جس کی شہرت گرد و نواح میں پھیلی ہوئی تھی۔ اتفاق سے اسے مارنے کی عادت پڑ گئی۔ کھولتے باندھتے یا چارہ ڈالتے ہوئے آدمی کا دھیان بٹا اور اس نے ٹکر ماری۔ گھر والے بڑے پریشان تھے۔ حسن دین کو ایسا موقع اللہ دے۔ بیل کا مالک حسن دین اور اس کے بڑے لڑکے یعقوب کا شناسا تھا۔ اس لیے براہِ راست سودا کرنا کچھ سود مند نہ ہوتا۔ لہٰذا اس نے ایک ترکیب نکالی۔ علی الصبح یعقوب کو بھیجا۔ وہ بیل کے مالک سے سلام دعا کر کے پاس بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد چھوٹا بھائی یوسف دوسری طرف سے آیا اور حقہ پینے کے بہانے ان کے پاس رُک گیا۔ دونوں بھائی ایک دوسرے سے انجان بنے رہے۔ باتوں باتوں میں یوسف نے کہا کہ میں ہل میں جوتنے کے لیے کسی اچھے بیل کی تلاش میں ہوں۔ یعقوب نے سامنے بندھے ہوئے بیل کی طرف اشارہ کیا اور بولا ''دیکھو یہ بیل کتنا شاندار ہے۔ یہی خرید لو۔'' یوسف نے جواب دیا ''اس بیل کی شہرت تو دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہے۔ میں ایسا بے وقوف نہیں کہ ایسا مرکھنا جانور خرید کر مصیبت مول لوں۔ وہی مثل ہو کہ آ بیل مجھے مار۔'' کافی دیر تک ردوکد ہوتی رہی۔ بیل کا مالک دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ کسی طرح اس آفت سے چھٹکارا ملے۔ غرض یہ کہ یعقوب کی ''ہمدردانہ'' کوشش سے بہت کم داموں میں سودا پٹ گیا۔ بیچنے والا بھی راضی اور خریدنے والا بھی خوش۔ یوسف بیل لے کر چلا گیا تو صاحبِ خانہ کی بیوی نے یعقوب سے پوچھا کہ یہ آدمی کس گاؤں کا ہے؟ جواب ملا ''میں نہیں جانتا۔ میں نے تو آج اسے پہلی بار دیکھا ہے۔'' ذرا دیر بعد

یعقوب نے اپنے گھر کا راستہ لیا۔

چند روز بعد بیل کی یہ سابق مالکہ کوٹلی لوہاراں جاتے ہوئے حسن دین کے کھیت کے پاس سے گزری۔ دیکھا کہ بیل بندھا ہے اور قریب ہی پڑی چارپائی پر یعقوب اور یوسف دوپہر کا کھانا کھا رہے ہیں۔ وہ ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی اور یعقوب سے کہنے لگی ''اُس روز تو تم اس شخص سے واقف ہی نہیں تھے۔ آج یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟'' جواب میں یعقوب کی بجائے حسن دین یوں گویا ہوا'' بی بی! خدا کا شکر ادا کرو۔ اگر یہ دونوں اس ترکیب سے کام نہ لیتے تو اب تک تمھارے گھر کا کوئی فرد اس بیل کی بھینٹ چڑھ چکا ہوتا اور اس کے چہلم پر یہی بیل ذبح کر کے تمھیں برادری کو کھلانا پڑتا۔'' عورت لاجواب ہو کر بولی ''اچھا یہ بتاؤ کہ یہ بیل تم لوگوں کو کیوں نہیں مارتا؟'' حسن دین نے کہا ''بات یہ ہے کہ تم اس سے کوئی کام نہیں لیتے تھے لہٰذا وہ اپنی طاقت مارنے میں صرف کرتا تھا۔ ہم اُس سے اس کی استطاعت کے مطابق کام لیتے ہیں۔ یاد رکھو بے کار آدمی کی طرح فارغ جانور کا دماغ بھی شیطان کا کارخانہ بن جاتا ہے۔''

اس قسم کے واقعات سن سن کر میں حسن دین سے کہتا کہ بچپن میں امیر امنیرا ٹھگ کے قصے سُن کر باور نہیں آتا تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے لیکن اب مجھے اعتبار آ گیا ہے کہ وہ باتیں ضرور سچی ہوں گی۔

برات، میلے اور راگ درباری کا چڑھاؤ جتنا شان وشوکت کا حامل ہوتا ہے اتنا ہی ان کا اتار مایوسی کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے۔ یہی حال ہماری ان لگ بھگ نصف صدی پر محیط محفلوں کا ہوا۔ بس نومبر ۱۹۹۷ء سے نومبر ۱۹۹۸ء تک ایک سال کے عرصے میں پوری عمارت زمیں بوس ہوگئی۔ ۲۹-نومبر ۱۹۹۷ء کو محمد شفیع نے پہل کی۔ ذیابیطس نے اسے گھن کی طرح کھا لیا تھا۔ جس طرح زندگی میں گھر والوں کو بتائے بغیر کسی طرف نکل

جاتا تھا، اسی طرح چپکے سے آخری سفر پر روانہ ہو گیا۔ ۱۹۹۸ء کے موسمِ بہار میں بھائی فقیر حسین بیمار پڑے۔ بڑی تگ و دو کے بعد پتہ چلا کہ دماغ میں رسولی ہے۔ جنرل ہسپتال، لاہور میں کامیاب آپریشن ہوا۔ فارغ ہو کر گھر چلے گئے تھے لیکن چند روز بعد اچانک طبیعت بگڑ گئی۔ پھر لاہور لے کر آئے جہاں ۷-مئی ۱۹۹۸ء کی شام داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ صبح عاشورہ (۱۴۱۹ھ) کا دن تھا۔ اسی روز انھیں گاؤں کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ان سے چھوٹا بھائی ایک عرصے سے علیل تھا۔ ۲۰-اکتوبر ۱۹۹۸ء کو وہ بھی راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ میں کراچی گیا ہوا تھا۔ واپسی پر یکم نومبر کو سعید صاحب کے ساتھ تعزیت کی غرض سے کوٹلی پہنچا۔ اتوار کا دن تھا۔ حسن دین سے ملاقات ہوئی۔ چھوٹتے ہی بولا "آج رات کو رہو گے نا؟ میں نے تمہارے لیے بہت سی باتیں جمع کر رکھی ہیں۔" اگلے دن سعید صاحب کی بطور وکیل بعض اہم مقدمات میں حاضری تھی۔ اس لیے ہم نے معذرت کرتے ہوئے جلد دوبارہ آنے کا وعدہ کیا۔ یہ سُن کر بجھ سا گیا جیسے اسے باتیں کرنے کی جلدی ہو۔

صرف دو دن بعد حسبِ معمول کھیت پر کام کر رہا تھا کہ فالج کا شدید حملہ ہوا۔ قوت گویائی سلب ہو گئی تھی۔ اسی حالت میں ۷-نومبر ۱۹۹۸ء کو یہ بلبلِ ہزار داستاں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

الف ایس ترنجن توں کت اگے تیرے ہان دیاں چرخے چُک گیاں
رہی شکل نہ اونہاں دی یاد سانوں جیہڑیاں صورتاں مٹی وچ لُک گیاں
تیرے نال دے رُکھ نہ رہے ساوے جھڑے پھُل پتر شاخاں سُک گیاں
بھلی چال سطرنج ہدایت اللہ بازی بُرد ہوئی گوٹاں مُک گیاں

....

حواشی:

١- مولانا اخلاق حسین قاسمی نے اپنی کتاب "دلّی کی برادریاں" میں یہ انکشاف کیا ہے کہ دہلی کے سادہ کاروں کا وہ طبقہ جو لاہوری کہلاتا تھا، ان کا آبائی تعلق بھی کوٹلی لوہاراں سے تھا۔

٢- جموں کی حدود میں شفیع کے گاؤں کا نام جوڑا تھا۔

٣- زمینوں کی زرخیزی کی تجدید کے لیے مویشیوں کو رات کے وقت خالی کھیتوں میں باندھ دیا جاتا ہے۔ اس عمل کو بہک بٹھانا کہتے ہیں۔

٤- میں نے پانچ ابیات پر مشتمل ان کا قطعۂ تاریخ وفات کہا تھا جو مرحوم کے مزار کی لوح پر کندہ ہے۔

-----◆○◆-----

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
١٣	١١	lapland	Lapland	١١٤	٤	ہکابکا ہوکر"	ہکابکا ہوکر
١٤	١٧	لتروال	لتروال	١١٥	١١	وہ	وہ تھا
٢٦	١	کھائی تھی	کھائی	١١٦	آخری	بعد تو	بعد میں لیا
٢٨	٧	١٩٦٠ء	١٩٦٥ء	١١٨	١٥	پڑا رہتا	پڑ رہتا
٤٣	٥	بشیرا	بشیرا ایک کر	١٢١	٨	کہ اس	کہ اگر اس
٤٤	آخری	عقلمند	خاصا عقلمند	١٢٢	٧	ابھرنی ڈوبتی	ابھرتی ڈوبتی
٤٥	١٤	ہونی تھی	ہوتی تھی	١٥٠	١٧	رہے ہیں۔	رہے ہیں۔١
٥٤	١٨	صف اتم	صف ماتم	١٥٢	٧	آئے تھے	آئے تھے۔٢
٦٣	٣	اورال اس	اوراب اس	١٥٢	١٧	بڑف	برف
٦٥	٥	نہیں آئے؟	نہیں آئے؟"	١٥٣	١٦	گنزواں	گترواں
١٠٨	٦	ایک پانچ	ایک سے پانچ	١٥٦	١٩	جاکو	جاکر
١١٣	٨	یقین رہا۔	یقین رہا	١٦٧	٦	کردیا گیا۔	کردیا گیا۔٣

مظہر محمود شیرانی